دسمبر 60

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۰۳۴۰

جلد ۵۵ | عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ٦ روپے | قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

چند امتیازی پہلو

● - زبان سلیس اور انداز بیان دور حاضر کے ترقی یافتہ ادبی ذوق کے مطابق ہے - ترجمہ میں روانی اس حد تک ہے کہ آدمی اگر اسے مسلسل پڑھتا جائے تو اسے ایک مربوط اور موثر کلام کا پورا کیف حاصل ہوتا ہے -

●● - ہر سورہ کے آغاز میں ایک تمہیدی نوٹ دیا گیا ہے جس میں سورہ کا زمانہ نزول ، تاریخی پس منظر اور وقت کا سیاسی ماحول قاری کے سامنے رکھ دیا گیا ہے نیز سورہ کے مرکزی مضمون کو بطور خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے -

●●● - اہم قرآنی اصطلاحات ، خاص خاص عبارات ، مطالعہ قرآن کے دوران میں پیدا ہونے والے مسائل اور تاریخی واقعات کی وضاحت حواشی میں کر دی گئی ہے -

●●●● - قرآن کے بیان کردہ تاریخی حقائق خواہ وہ انبیائے ماسبق سے تعلق رکھتے ہوں یا حضور خاتم النبیین کے کارنامۂ حیات سے متعلق ہوں ، ان کو سمجھنے کے لئے نہایت مفید نقشے بلاکوں سے طبع کرا کے شامل کئے گئے ہیں -

●●●●● - شروع میں مقدمہ و دیباچہ میں فاضل مولف نے وہ باتیں بیان کی ہیں جو قرآن فہمی کے لئے کلید کی حیثیت رکھتی ہیں -

●●●●●● - ہر جلد کے آخر میں اسمائے اعلام اور اصطلاحات قرآنی کا تفصیلی انڈکس شامل ہے جس کی مدد سے کسی بھی موضوع پر متفرق قرآنی آیات کو بیک نظر دیکھا اور جمع کیا جا سکتا ہے -

ہدیہ

جلد اول سورہ الفاتحہ سے سورۃ الانعام تک - -/۱۲ روپے

جلد دوم سورہ الاعراف سے سورہ بنی اسرائیل تک ۱۸/۸ روپے

تفسیر سورہ نور (الگ کتابی سائز پر) قسم اول -/۶ روپے

قسم دوم ۸/۸ روپے قسم سوم ۳/۸ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۵ | بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء | عدد ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

وہ لوگ جو مغربی تہذیب کے زیر اثر آچکے ہیں یا آرہے ہیں اُن کی زندگی کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے ہاں خوف و ہراس کی ایک عام کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہاں ہر متنفس اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے اور اس بات کے لیے سخت کوشاں رہتا ہے کہ کسی طرح اپنی زندگی کو محفوظ و مامون بنائے۔ اس کی حرکات و سکنات اسی احساس کی غمازی کرتی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف انفرادی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ اُن کی حیاتِ اجتماعی بھی اسی قسم کے خوف سے گھری ہوئی ہے۔ اور اس بنا پر جس قسم کی حرکات ایک فرد کرتا ہے۔ اسی قسم کی حرکات ایک قوم سے بھی سرزد ہوتی ہیں۔

ممکن ہے ہماری اس گزارش پر کوئی صاحب یہ کہیں کہ جان و مال کی حفاظت کا جذبہ تو انسان کی فطرت میں شروع سے داخل ہے اور یہ چیز دورِ جدید میں کوئی نئی نہیں۔ انسان نے جس دن سے دنیا میں جنم لیا ہے اُسی روز سے یہ احساس اُس کے اندر موجود چلا آرہا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت اُس نے غاروں کی تلاش کی، مکانات تعمیر کیے، مختلف قسم کے اوزار و ہتھیار بنائے اور افواج کو ترتیب دیا۔ انسان اپنے تحفظ کے لیے ہمیشہ سے جدوجہد کرتا رہا ہے اور اسی جدوجہد نے اُسے ترقی کے بامِ بلند پر پہنچایا ہے۔

اس بات میں بلاشبہ ایک جزو صداقت کا بھی ہے لیکن یہ کہنا کہ جس نوعیت کا خوف و ہراس آج انسانوں پر طاری ہے وہ ماضی میں بھی تھا قطعاً صحیح نہیں۔ ایک انسان بھوک سے بچنے کے لیے زمین کا سینہ چاک کر کے اُس میں سے گندم اگاتا ہے۔ اس کا یہ عمل اپنی ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہی ہے لیکن آپ اُس شخص کی اس فطری ضرورت اور اس کی اس فطری جدوجہد کو اُس شخص کے ظالمانہ رویہ پر کس طرح قیاس کر سکتے ہیں جو پورے گاؤں کی فصل کو جبر و استبداد کے ساتھ اپنے گھر میں ڈال لیتا ہے اور گاؤں کے سارے لوگ ایک ایک دانہ سے ترستے رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک قوم اپنی حفاظت اور پاسبانی کے لیے اپنی سرحدی چوکیوں پر فوج بٹھا دیتی ہے۔ اس قوم کا یہ طرزِ عمل اپنی حد تک بالکل فطری اور مناسب ہے، دنیا کی ہر قوم کو اپنی آزادی کو غیروں کی دست برد سے بچانے کا پورا پورا حق حاصل ہے لیکن اگر کوئی ظالم اور سفاک قوم کمزور قوموں پر برقِ خاطف بن کر گرے، ان کے امن کو برباد کرے، ان کے نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتارے، اُن کی عورتوں کی عصمت و عفت پر حملے کرے اور اُن کی دولت کو لوٹ کر اپنے ملک میں لے جائے تو اس کے بارے میں کوئی صاحبِ ہوش ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ اُس کے یہ سارے ظالمانہ ہتھکنڈے صرف اپنی بقا کے لیے ہیں۔ ان میں کسی غیر کو ستانا مقصود نہیں۔

خوف انسان کی ایک فطری جبلت ہے اور اگر یہ اپنی جائز حد تک رہے تو اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں، بلکہ اپنی فطری حد تک اس سے بسا اوقات تعمیری کام بھی لیے جا سکتے ہیں لیکن یہی جذبہ جب بھوک، پیاس، جنسی خواہش جیسے دوسرے داعیات کی طرح اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو اس سے بہت خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ پیٹ کو جس طرح معاشرت اور تہذیب و تمدن کی اساس بنانے سے ایک انتہائی بے حس اور

آمرانہ نظام معرضِ وجود میں آتا ہے۔ صنفی خواہش کو انسانی فکر و عمل کا واحد محرک قرار دینے سے اخلاقی اقدار درہم برہم ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح ڈر اور خوف کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بنانے سے افراد اور قوموں کے اندر پاگل پن کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اُن کی زندگی کے فطری نظم کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔ اس جذبہ کے تحت آکر اُن سے ایسے افعال و اعمال سرزد ہونے ہیں جن کی وجہ سے اُن کے سارے شعبوں میں ایک زبردست بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

اس جذبہ کے خوفناک نتائج کا ذکر کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب سے پہلے یہ دریافت کریں کہ دورِ جدید میں خوف و ہراس کی اس عام وبا کے پھیلنے کے کیا اسباب ہیں علم نفسیات کے ماہرین نے اس معاملہ میں جس قدر جستجو کی ہے وہ اسی ایک نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خوف کی یہ غیر معمولی کیفیت مذہب سے بُعد اور بیگانگی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ انسان نے جس وقت سے اللہ تعالیٰ سے اپنے خالق، رازق اور معبود کی حیثیت سے رشتہ منقطع کر لیا ہے اُسی وقت سے اس کی زندگی مختلف قسم کے خطرات میں گھر گئی ہے جنہوں نے اس کے اندر عجیب و غریب نفسیاتی الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔

انسان کے دیگر حواس کی طرح اُس کے اندر ایک حاسّہ عبودیت بھی رکھا گیا ہے۔ یہ حاسہ اُسے ہر لحظہ اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنا سرِ نیاز کسی برتر قوت کے سامنے خم کرے، اُسی کی رحمت کا طالب ہو، اُس کے سامنے عزت و مال کے حصول کے لیے ہاتھ پھیلائے، اپنی خطا کاریوں پر اُس کے حضور میں نادم ہو اور اُس ذات سے عفو طلب کرے۔ جب اُس کی زندگی پر مصائب ہجوم کریں جن سے نبرد آزما ہونے کی وہ ہمت اپنے آپ میں نہ پاتا ہو تو اس بلند و بالا ہستی سے امداد کی درخواست کرے۔ اپنا مستقبل اسی ذات

کے ہاتھوں میں سونپے۔ یہ سب احساسات وجذبات انسان میں فطری طور پر ودیعت کیے گئے ہیں اور ان سے کوئی شخص بھی عاری نہیں رکھا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک بت پرست عابد و معبود کے اس نازک تعلق کو بتوں کے ساتھ استوار کر لیتا ہے، ایک مادہ پرست مادّہ کو یہ ارفع و اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے، دورِ جدید کا ایک شہری سیاست کے اندر اُلوہیت کی وہ شان پیدا کر دیتا ہے جو درحقیقت خداوند تعالیٰ کو زیب دیتی ہے۔ اور ایک مسلمان یہ رشتہ اُس ذات کے ساتھ باندھتا ہے جو فی الواقع اس کی مستحق ہے۔ اختلاف جو کچھ موجود ہے وہ احساسِ عبودیت میں نہیں بلکہ ذاتِ معبود میں ہے۔

سروری چونکہ اُسی ذات بے ہمتا کو زیب دیتی ہے جو اس کائنات کی خالق، مالک، مدبّر اور فرما نروا ہے اور باقی سب "بتانِ آذری ہیں"۔ اس لیے جن لوگوں نے بھی خداوند تعالیٰ سے اپنا رشتہ توڑ کر دوسرے بتوں سے جوڑا ہے اُن کی زندگی میں اختلال کا پیدا ہونا بالکل ایک قدرتی امر ہے اور اس اختلال کے مختلف مظاہر میں سے ایک مظہر خوف و ہراس بھی ہے۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف میں ہے۔

اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۱۲:۸۷)	اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

اسی طرح حٰمٓ سجدہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اہلِ ایمان کو نہ صرف آخرت میں ہر قسم کا سکون و اطمینان میسر ہو گا بلکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اُن کی دستگیری فرمائے گا اور انہیں ہر قسم کے خوف سے محفوظ و مامون رکھے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	جن لوگوں نے دل و جان سے اس امر کا اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہی ہے اور وہ پھر اپنے

اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۔

اس وعدہ پر ثابت قدم رہے۔ اُن پر فرشتے نازل ہوں گے اور کہیں گے کہ تم نہ تو اندیشہ کرو اور نہ غم کھاؤ، اور جنت کی بشارت ہو جس کا (انبیاء علیہم السلام) نے تم سے وعدہ کیا تھا ہم اس دنیاوی زندگی میں بھی تمہارے رفیق تھے اور آخرت میں بھی (اس جنت) میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کی تم خواہش کروگے اور ہر وہ چیز حاضر کی جائیگی جس کے تم طلبگار ہوگے۔

پھر سورۂ رعد میں نہایت واضح طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اطمینانِ قلب جو خوف کی ضد ہے، ایک داخلی کیفیت کا نام ہے اس لیے اسے خارجی زندگی میں تلاش کرنا بالکل بے سود ہے۔ جو لوگ اس نعمتِ غیر مترقبہ کے متمنی ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اندازِ فکر کو تبدیل کریں۔ عزوجاہ اور مال ومتاع کی فراوانی اس معاملہ میں کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ خوف وہراس کو دُور کرنے والی چیز صرف یادِ الٰہی ہے انسان کے دل ودماغ میں جب تک محبت الٰہی جاگزیں نہیں ہوگی اس وقت تک اس کا دل خوف کی آماجگاہ بنا رہے گا اور جس لمحہ یہ نور اس کے سینے کو منور کرے گا اُسی لحظہ خوف وہراس کے بادل چھٹ جائیں گے اور اُس کی زندگی شعاعِ امید سے جگمگا اٹھے گی۔ یادِ الٰہی خوف کو دُور کرنے کا واحد مجرب نسخہ ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳-۴)

خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔

عہدِ حاضر کے انسان نے سب سے بڑی حماقت یہی کی ہے کہ اُس نے اطمینانِ قلب جیسی

متاعِ گراں مایہ کو داخل میں تلاش کرنے کی بجائے خارج میں تلاش کیا ہے اور پھر اس کے حاصل کرنے کے لیے وہ اُن معبودانِ باطل کے آستانوں پر جھکا ہے جن کے ہاں یہ چیز نہ کبھی پہلے کسی کو ملی تھی اور نہ مل سکتی ہے۔ ایسے معبود جو خود خواہشات کے غلام ہوں، جن کا خمیر مادیت سے اٹھایا گیا ہو، جو زمان و مکان کے پابند ہوں، جنھیں حالات و واقعات کی ہر جنبش ہر آن تبدیل کرتی رہتی ہے جو اپنے حفظ و بقا کے لیے انسانی فکر و عمل کے محتاج ہوں۔ ان کے ہاں سے اطمینانِ قلب جیسی لطیف شے کا تلاش کرنا دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔

اس "دیوانگی" میں یوں تو بعض لوگ شروع ہی سے مبتلا رہے ہیں لیکن اس نے ایک منظم تحریک کی صورت اُس وقت اختیار کی جب انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اُس سے کام لینے کا ڈھنگ سیکھا۔ یہ تبدیلی چونکہ عالمِ اسباب میں واقع ہوئی اور اس سے اہلِ مغرب کو وقتی طور پر مادی خوش حالی بھی نصیب ہوئی اس لیے انہوں نے غلطی سے یہ فرض کر لیا کہ انسان کا حقیقی معبود صرف مادّہ ہے اور اس باطل معبود کی رحمت جب جوش میں آتی ہے تو وہ اپنا جلوہ انسانوں کو زود پیدا آوری اور کثیر پیدا آوری میں دکھاتی ہے۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی سے پھر ساری دنیا ہی بدل گئی۔ پرانے معابد کی جگہ نئے معابد تعمیر ہونے لگے۔ اخلاق کے مروجہ ضابطے باطل قرار پائے اور اُن کی جگہ اخلاق کے نئے نئے قوانین وضع ہوئے۔ اس "جدید مذہب" کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے ایک نیا طبقہ معرضِ وجود میں آیا جو اگرچہ اپنے آپ کو بڑا آزاد خیال اور وسیع القلب کہتا ہے، لیکن اپنے معاملات میں انتہائی کم ظرف اور متعصب واقع ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں پر حکومت ہے وہ عیسائیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے۔ مغربی نفسیات اور مغربی زندگی سے اس کی قدم قدم پر تصدیق ہوتی ہے۔ محمد اسد صاحب نے اپنی کتاب "اسلام چوراہے پر" میں اس حقیقت کو بڑی وضاحت اور صفائی سے بیان کیا ہے۔ وہ

کہتے ہیں :

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریق پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیبی روح سے ہم آہنگ کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں لیکن یہ مستثنے مثالیں ہیں ۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی وہ جمہوری ہو یا فاشستی سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، دستکار ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ اب ایک ہی مذہب پر ایمان رکھتا ہے، وہ کیا ہے؟ مادی زندگی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض وغایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پر راحت اور آزاد اور بے قید بنایا جائے ۔ اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں کارخانے، رقص گاہیں، کیمیاوی دارالصنعت، تفریح گاہیں اور بجلی کے مراکز، اس مذہب کے پروہت بنکوں کے افسران، انجنیئر، اداکار عورتیں، فلم سٹار اور تجارت وصنعت کی بڑی بڑی مرکزی شخصیتیں اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں ۔ طاقت ولذت کی اس ہوس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حریف گروہ سامانِ جنگ سے لیس اور پوری جنگی تیاریوں کے ساتھ ایک دوسرے کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے پر تول رہے ہیں تاکہ جب بھی ان کے مصالح اور خواہشات میں تصادم ہو تو وہ فوراً ایک دوسرے پر پل پڑیں ۔ اور تہذیبی نقطۂ نظر سے انسانوں کا ایک ایسا گروہ معرضِ وجود میں آیا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے عملی فائدہ کا اور اس کے نزدیک خیر وشر کا انتہائی معیار محض مادی کامیابی ہے[1]۔"

---

[1] Islam at the Cross Road p 50.

اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے[۲۵]، اسی طرح تم لوگ بھی (حالتِ موت سے)

اپنے قول اور عمل سے اُن کی طرف رہنمائی نہ فرماتے۔

یہاں ذرا تھوڑی دیر ٹھیر کر منکرینِ حدیث کی اِس جسارت پر غور کیجیے کہ وہ "نماز پڑھنے" کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نماز جو آج مسلمان پڑھ رہے ہیں یہ سرے سے وہ چیز ہی نہیں ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ قرآن تو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، اور اس سے مراد نماز پڑھنا نہیں بلکہ "نظامِ ربوبیت" قائم کرنا ہے۔ اب ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ کونسا نرالا نظامِ ربوبیت ہے جسے یا تو طلوعِ آفتاب سے پہلے قائم کیا جا سکتا ہے یا پھر زوالِ آفتاب کے بعد سے کچھ رات گزرنے تک؟ اور وہ کونسا نظامِ ربوبیت ہے جو خاص جمعہ کے دن قائم کیا جانا مطلوب ہے؟ (اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ) اور نظامِ ربوبیت کی آخر وہ کونسی خاص قسم ہے کہ اسے قائم کرنے کے لیے جب آدمی کھڑا ہو تو پہلے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھوئے۔ اور سر پر مسح کرے ورنہ وہ اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ ...) اور نظامِ ربوبیت کے اندر آخر یہ کیا خصوصیت ہے کہ اگر آدمی حالتِ جنابت میں ہو تو جب تک وہ غسل نہ کر لے اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ ... وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا)۔ اور یہ کیا معاملہ ہے کہ اگر آدمی عورت کو چھو بیٹھا ہو اور پانی نہ ملے تو اس عجیب و غریب نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لیے اُسے پاک مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے اور منہ پر ملنا ہوگا؟ (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ مِّنْہُ)۔ اور یہ کیسا عجیب نظامِ ربوبیت ہے کہ اگر سفر پیش آجائے تو آدمی اسے پورا قائم کرنے کے بجائے آدھا ہی قائم کرے؟ (وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ)۔ پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ اگر جنگ کی حالت ہو تو فوج کے آدھے سپاہی ہتھیار لیے ہوئے امام کے پیچھے "نظامِ ربوبیت" قائم کرتے رہیں اور آدھے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہیں،

جذبہ انتہائی طور پر ترقی کر چکا ہے۔

مال و متاع کے متعلق اہلِ یورپ کا یہ جذبہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں بلکہ یہ وہ عالم عیان ہے جسے ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ محسوس کر سکتا ہے۔ اور اب تو یہ چیز صرف یورپ تک ہی محدود نہیں رہی۔ وہ قومیں جو مغربی تہذیب کے زیرِ اثر آئی ہیں یا آ رہی ہیں اُن میں بھی اس قسم کے تغیرات بڑی سرعت کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں اور ہر اُس شخص کو دعوتِ فکر دے رہے ہیں جو کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی سے ہمارے معاشرے پر جو اثرات نمایاں ہوتے ہیں وہ نوعیت کے اعتبار سے اُن اثرات سے پوری طرح ملتے جلتے ہیں جو یورپ میں گزشتہ صدی میں ظاہر ہوئے تھے۔ دولت اندوزی کا جنون، ہوسِ اقتدار، کثیر پیدا آوری اور زود پیدا آوری کے لیے وسیع و عریض منصوبے، خود غرضی اور نفس کی بندگی، ریاست کا غیر مسئول اقتدار، حکمران طبقے کا جاہ و جلال اور ایک فرد کی بے بسی اور درماندگی یہ سب اسی مادہ پرستی کے مختلف شاخسانے ہیں۔

مادہ پرستی کے ان رنگا رنگ مظاہر کے پس پردہ اگر جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں خوف ہی مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ اور جن کاموں کو ہم بڑے تعمیری کام سمجھتے ہیں اُن کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آئے گا۔ مثلاً آپ چاند کے سفر کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان چاند کی طرف کچھ اس وجہ سے نہیں جا رہا کہ اُس نے اس زمین کے سارے مسائل کو اب بڑی خوش اسلوبی سے حل کر لیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسری دنیاؤں میں پہنچ کر اپنی قوتِ فکر و عمل سے انہیں جنت بنائے۔ اس دنیا میں ابھی اُس کی تگ و تاز کے لیے ایک وسیع میدان موجود ہے۔ سارے مسائل تو ایک طرف رہے

وہ ابھی تک اپنی ساری دماغی صلاحیتوں کے باوجود فرد اور معاشرے کے درمیان صحیح توازن پیدا نہیں کر سکا۔ وہ جب فرد کو اہمیت دیتا ہے تو سرمایہ دارانہ نظام اپنی ساری قہرمانیوں کے ساتھ لوگوں پر مسلط ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس جب وہ فرد کے مقابلے میں معاشرے کی اہمیت بڑھاتا ہے تو اشتراکیت کا دیوِ استبداد افراد کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لیتا ہے۔ انسان ابھی تک اسی الجھن میں گرفتار ہے اور اس سے مفر کی اُسے کوئی صورت بجز اس کے نظر نہیں آتی کہ وہ یہاں سے کسی دوسری دنیا میں بھاگ جائے۔

اس تہذیب نے اُسے اپنے مستقبل کے بارے میں اس قدر خوفزدہ کر دیا ہے کہ بقائے نوع کے لیے اُسے سوائے نسل کشی کے اور کوئی تدبیر نہیں سوجھتی۔ زمین اپنی ساری پہنائیوں کے باوجود اس پر تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ شماریات کے ماہرین اُسے یہ مسلسل باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وسائلِ رزق اب اپنے اختتام کو پہنچ چکے ہیں اور اگر اس نے نوعِ بشری میں اضافہ کیا تو پھر اس کرۂ ارضی پر اس کا جینا محال ہو گا۔ آج کا انسان مایوسی کے اس عالم میں کبھی اسقاطِ حمل کو اپنی حکومت سے جائز قرار دلوانے کی کوشش کرتا ہے، کبھی حمل کو روکنے کے لیے زہریلی سے زہریلی ادویات استعمال میں لاتا ہے اور کبھی ساری عمر مجرّد گزارنے کے منصوبے بناتا ہے، لیکن اس کا ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتے نہیں پاتا کہ جس خدا نے اُسے پیدا کیا ہے اُس نے اُس کے رزق کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ جس کرۂ ارضی کو وہ اپنے لیے اب انتہائی تنگ محسوس کر رہا ہے اُس کا حال یہ ہے کہ انسان نے اپنی ساری ہنرمندیوں کے باوجود اُس کے صرف $\frac{1}{4}$ حصّے سے نہایت محدود پیمانے پر استفادہ کیا ہے۔ یہ دنیا چھتیس کھرب ایکڑ زمین پر مشتمل ہے اور انسان اس وقت خوراک کے لیے تقریباً $3\frac{1}{2}$ کھرب ایکڑ رقبہ سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔[1] پھر زیرِ کاشت زمین میں بھی

[1] LET THERE BE BREAD; BY ROBERT BRIUAIN. p 15.

توسیع و ترقی کے ابھی پورے امکانات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود اس پر خوف و ہراس طاری ہے۔

آج بدقسمتی سے قوموں کو زندہ رکھنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے سوائے خوف اور نفرت کے اور کوئی محرک نہیں رہا۔ چنانچہ قومی رہنما نفرت اور خوف کے ذریعہ ہی اپنی قوم کے جذبات برانگیختہ کرتے ہیں اور اس کے اندر مصنوعی ہیجان اور اشتعال پیدا کر کے اُسے عمل پر ابھارتے ہیں۔ پروفیسر جوڈ نے اس حقیقت کا بڑے واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"وہ مشترک جذبات جنہیں آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی، اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں ... جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لیے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کرلیں جس سے وہ نفرت کرے اور اس کے لیے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کرلیں جن سے وہ خوف زدہ ہو۔ اگر میں فی الحقیقت دنیا کی مختلف قوموں کو متحد کرنے کا آرزومند ہوں تو مجھے کسی دوسرے سیارے پر کوئی دشمن تیار کرنا ہوگا۔ مثلاً چاند پر جس سے یہ سب قومیں ڈریں۔ اس بنا پر یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرنے میں نفرت اور خوف کو ہی اپنا رہنما بناتی ہیں۔ انہیں جذبات پر ان سلطنتوں کے حکمرانوں کی ترقی کا دارومدار ہے اور یہی خوف و نفرت قومی اتحاد کی اساس بھی ہے۔

توسیع و ترقی کے ابھی پورے امکانات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود اس پر خوف وہراس طاری ہے۔

آج بد قسمتی سے قوموں کو زندہ رکھنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے سوائے خوف اور نفرت کے اور کوئی محرک نہیں رہا۔ چنانچہ قومی رہنما نفرت اور خوف کے ذریعہ ہی اپنی قوم کے جذبات برانگیختہ کرتے ہیں اور اس کے اندر مصنوعی ہیجان اور اشتعال پیدا کر کے اُسے عمل پر ابھارتے ہیں۔ پروفیسر جوڈ نے اس حقیقت کا بڑے واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"وہ مشترک جذبات جنہیں آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی، اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں ... جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لیے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کر لیں جس سے وہ نفرت کرے اور اس کے لیے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کر لیں جن سے وہ خوف زدہ ہو۔ اگر میں فی الحقیقت دنیا کی مختلف قوموں کو متحد کرنے کا آرزو مند ہوں تو مجھے کسی دوسرے سیارے پر کوئی دشمن تیار کرنا ہو گا۔ مثلاً چاند پر جس سے یہ سب قومیں ڈریں۔ اس بنا پر یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرنے میں نفرت اور خوف کو ہی اپنا رہنما بناتی ہیں۔ انہیں جذبات پر ان سلطنتوں کے حکمرانوں کی ترقی کا دارومدار ہے اور یہی خوف و نفرت قومی اتحاد کی اساس بھی ہے۔

ہوئے شریکوں میں کوئی اُن کا سفارشی نہ ہوگا[16] اور وہ اپنے ان شریکوں کے منکر ہو جائیں گے[17]۔
جس روز وہ ساعت برپا ہوگی، اس دن (سب انسان) الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے[18]۔

جنہوں نے خدا سے بغاوت کی ہے، اس کے رسولوں کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے، آخرت کی جواب دہی کے منکر یا اس سے بے فکر رہے ہیں، اور دنیا میں خدا کے بجائے دوسروں کی یا اپنے نفس کی بندگی کرتے رہے ہیں، خواہ اس بنیادی گمراہ کے ساتھ انہوں نے وہ افعال کیے ہوں یا نہ کیے ہوں جنہیں عرفِ عام میں جرائم کہا جاتا ہے۔ مزید براں اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے خدا کو مان کر، اس کے رسولوں پر ایمان لاکر، آخرت کا اقرار کر کے پھر دانستہ اپنے رب کی نافرمانیاں کی ہیں اور آخر وقت تک اپنی اس باغیانہ روش پر ڈٹے رہے ہیں۔ یہ لوگ جب اپنی توقعات کے بالکل خلاف عالمِ آخرت میں یکایک جی اٹھیں گے اور دیکھیں گے کہ یہاں تو واقعی وہ دوسری زندگی پیش آگئی ہے جس کا انکار کر کے یا جسے نظر انداز کر کے وہ دنیا میں کام کرتے رہے تھے، تو ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے اور وہ کیفیت ان پر طاری ہوگی جس کا نقشہ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ کے الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

[16] شرکاء کا اطلاق تین قسم کی ہستیوں پر ہوتا ہے۔ ایک، ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور شہداء اور صالحین جن کو مختلف زمانوں میں مشرکین نے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دیکر ان کے آگے مراسمِ عبودیت انجام دیئے ہیں۔ وہ قیامت کے روز صاف کہہ دیں گے کہ تم یہ سب کچھ ہماری مرضی کے بغیر، بلکہ ہماری تعلیم و ہدایت کے سراسر خلاف کرتے رہے ہو، اس لیے ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہم سے کوئی امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری شفاعت کے لیے خدائے بزرگ کے سامنے کچھ عرض معروض کریں گے۔ دوسری قسم اُن اشیاء کی ہے جو بے شعور یا بے جان ہیں، جیسے چاند، سورج، سیارے، درخت، پتھر اور حیوانات وغیرہ۔ مشرکین نے ان کو خدا بنایا اور ان کی پرستش کی اور ان سے دعائیں مانگیں، مگر وہ بے چارے بے خبر ہیں کہ اللہ میاں کے خلیفہ صاحب یہ ساری نیاز مندیاں اُن کے لیے وقف فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی وہاں ان کی شفاعت کے لیے آگے بڑھنے والا نہ ہوگا۔ تیسری قسم اُن اکابر مجرمین کی ہے جنہوں نے خود کوشش کر کے، مکر و فریب سے کام لیکر، جھوٹ کے جال

پھیلا کر، یا طاقت استعمال کر کے دنیا میں خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائی، مثلاً شیطان، جھوٹے مذہبی پیشوا، اور ظالم و جابر حکمراں وغیرہ۔ یہ وہاں خود گرفتارِ بلا ہوں گے، اپنے ان بندوں کی سفارش کے لیے آگے بڑھنا تو درکنار، اُن کی تو اُلٹی کوشش یہ ہوگی کہ اپنے نامۂ اعمال کا بوجھ ہلکا کریں اور داورِ محشر کے حضور یہ ثابت کر دیں کہ یہ لوگ اپنے جرائم کے خود ذمہ دار ہیں، ان کی گمراہی کا وبال ہم پر نہیں پڑنا چاہیے۔ اس طرح مشرکین کو وہاں کسی طرف سے بھی کوئی شفاعت بہم نہ پہنچے گی۔

ﷺ یعنی اُس وقت یہ مشرکین خود اس بات کا اقرار کریں گے کہ ہم ان کو خدا کا شریک ٹھیرانے میں غلطی پر تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل جائیگی کہ فی الواقع ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس لیے جس شرک پر آج وہ دنیا میں اصرار کر رہے ہیں، اسی کا وہ آخرت میں انکار کریں گے۔

ﷺ یعنی دنیا کی وہ تمام جتھہ بندیاں جو آج قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ و برادری، اور معاشی و سیاسی مفادات کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں، اُس روز ٹوٹ جائیں گی، اور خالص عقیدے اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر نئے سرے سے ایک دوسری گروہ بندی ہوگی۔ ایک طرف نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی قوموں میں سے مومن و صالح انسان الگ چھانٹ لیے جائیں گے اور ان سب کا ایک گروہ ہوگا۔ دوسری طرف ایک ایک قسم کے گمراہانہ نظریات و عقائد رکھنے والے، اور ایک ایک قسم کے جرائم پیشہ لوگ اس عظیم الشان انسانی بھیڑ میں سے چھانٹ چھانٹ کر الگ نکال لیے جائیں گے اور ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام جس چیز کو اِس دنیا میں تفریق اور اجتماع کی حقیقی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسے جاہلیت کے پرستار یہاں ماننے سے انکار کرتے ہیں، آخرت میں اسی بنیاد پر تفریق بھی ہوگی اور اجتماع بھی۔ اسلام کہتا ہے کہ انسانوں کو کاٹنے اور جوڑنے والی اصل چیز عقیدہ اور اخلاق ہے۔ ایمان لانے والے اور خدائی ہدایت پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھنے والے ایک امت ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں، اور کفر و فسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری امت ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی نسل و وطن سے ہو۔ ان دونوں کی قومیت ایک نہیں ہو سکتی۔ یہ نہ دنیا میں ایک مشترک راہِ زندگی بنا کر ایک ساتھ چل سکتے ہیں

جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایک باغ[19] میں شاداں و فرحاں[20] رکھے جائیں گے۔ اور جنہوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو

اور نہ آخرت میں ان کا انجام ایک ہو سکتا ہے۔ دنیا سے آخرت تک ان کی راہ اور منزل ایک دوسرے سے الگ ہے۔ جاہلیت کے پرستار اس کے برعکس ہر زمانے میں اصرار کرتے رہے ہیں اور آج بھی اسی بات پر مصر ہیں کہ جتھہ بندی نسل اور وطن اور زبان کی بنیادوں پر ہونی چاہیے، ان بنیادوں کے لحاظ سے جو لوگ مشترک ہوں انہیں بلالحاظ مذہب و عقیدہ ایک قوم بن کر دوسری ایسی ہی قوموں کے مقابلے میں متحد ہونا چاہیے، اور اس قومیت کا ایک ایسا نظام زندگی ہونا چاہیے جس میں توحید اور شرک اور دہریت کے معتقدین سب ایک ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہی تخیل ابوجہل اور ابولہب اور سرداران قریش کا تھا، جب وہ بار بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ اس شخص نے آکر ہماری قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ اسی پر قرآن مجید یہاں متنبہ کر رہا ہے کہ تمہاری یہ تمام جتھہ بندیاں جو تم نے اس دنیا میں غلط بنیادوں پر کر رکھی ہیں آخرکار ٹوٹ جانے والی ہیں، اور نوع انسانی میں مستقل تفریق انہی عقیدے اور نظریۂ حیات اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر ہونے والی ہے جس پر اسلام دنیا کی اس زندگی میں کرنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں کی منزل ایک نہیں ہے ان کی راہ زندگی آخر کیسے ایک ہو سکتی ہے۔

[19] "ایک باغ" کا لفظ یہاں اس باغ کی عظمت و شان کا تصور دلانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان کی طرح اردو میں بھی یہ انداز بیان اس غرض کے لیے معروف ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی کو ایک بڑا اہم کام کرنے کو کہے اور اس کے ساتھ یہ کہے کہ تم نے یہ کام اگر کر دیا تو میں تمہیں "ایک چیز" دونگا، تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ چیز عدد کے لحاظ سے ایک ہو گی۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے انعام میں تم کو ایک بڑی قیمتی چیز دوں گا جسے پا کر تم نہال ہو جاؤ گے۔

[20] اصل میں لفظ یُحۡبَرُوۡنَ استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں مسرت، لذت، شان و شوکت اور تکریم کے تصورات شامل ہیں۔ یعنی وہاں وہ بڑی عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے، خوش و خرم رہیں گے اور ہر طرح کی لذتوں سے شاد کام ہوں گے۔

جھٹلایا ہے[۲۱] وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے۔

پس[۲۲] تسبیح کرو اللہ کی[۲۳] جبکہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو۔ آسمانوں اور زمین میں اُسی کے لیے حمد ہے۔ اور تسبیح کرو اس کی تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا

۲۱؎ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایمان کے ساتھ تو عملِ صالح کا ذکر کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں وہ شاندار انجام نصیب ہوگا، لیکن کفر کا انجام بد بیان کرتے ہوئے عملِ بد کا کوئی ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفر بجائے خود آدمی کے انجام کو خراب کر دینے کے لیے کافی ہے خواہ عمل کی خرابی اس کے ساتھ شامل ہو یا نہ ہو۔

۲۲؎ یہ "پس" اس معنی میں ہے کہ جب تمہیں یہ معلوم ہوگیا کہ ایمان و عملِ صالح کا انجام وہ کچھ اور کفر و تکذیب کا انجام یہ کچھ ہے تو تمہیں یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ نیز یہ "پس" اس معنی میں بھی ہے کہ مشرکین و کفار حیاتِ اُخروی کو ناممکن قرار دے کر اللہ تعالیٰ کو دراصل عاجز و درماندہ قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا تم اس کے مقابلہ میں اللہ کی تسبیح کرو اور اس کمزوری سے اس کے پاک ہونے کا اعلان کرو۔

۲۳؎ اللہ کی تسبیح کرنے سے مراد اُن تمام عیوب اور نقائص اور کمزوریوں سے، جو مشرکین اپنے شرک اور انکارِ آخرت سے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُس ذاتِ بے ہمتا کے پاک اور منزہ ہونے کا اعلان و اظہار کرنا ہے۔ اس اعلان و اظہار کی بہترین صورت نماز ہے۔ اسی بنا پر ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ابن زید اور دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں تسبیح کرنے سے مراد نماز پڑھنا ہے۔ اس تفسیر کے حق میں یہ صریح قرینہ خود اس آیت میں موجود ہے کہ اللہ کی پاکی بیان کرنے کے لیے اس میں چند خاص اوقات مقرر کیے گئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر محض یہ عقیدہ رکھنا مقصود ہو کہ اللہ تمام عیوب و نقائص سے منزہ ہے، تو اس کے لیے صبح و شام اور ظہر و عصر کے اوقات کی پابندی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہ عقیدہ تو مسلمان کو ہر وقت رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر محض زبان سے اللہ کی پاکی کا اظہار مقصود ہو، تب بھی ان اوقات کی تخصیص کے کوئی معنی نہیں، کیونکہ یہ اظہار تو مسلمان کو ہر موقع پر کرنا چاہیے۔ اس لیے اوقات کی پابندی کے ساتھ تسبیح کرنے کا حکم لامحالہ اُس کی ایک خاص عملی صورت ہی کی طرف

آیت۱۹- وہ زندہ میں سے مُردے کو نکالتا ہے اور مُردے میں سے زندہ کو نکال لاتا ہے

اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ عملی صورت نماز کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ت۱۸ اس آیت میں نماز کے چار اوقات کی طرف صاف اشارہ ہے: فجر، مغرب، عصر اور ظہر۔ اس کے علاوہ مزید اشارات جو قرآن مجید میں اوقات نماز کی طرف کیے گئے ہیں، حسب ذیل ہیں:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل - ۷۸)	نماز قائم کرو آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کی تاریکی تک، اور فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا اہتمام کرو۔
وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ - (ہود - آیت ۱۱۴)	اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ - (طٰہٰ - آیت ۱۳۰)	اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے، اور رات کی کچھ گھڑیوں میں پھر تسبیح کرو۔ اور دن کے کناروں پر۔

ان میں سے پہلی آیت بتاتی ہے کہ نماز کے اوقات زوالِ آفتاب کے بعد سے عشا تک ہیں، اور اس کے بعد پھر فجر کا وقت ہے۔ دوسری آیت میں دن کے دونوں سروں سے مراد صبح اور مغرب کے اوقات ہیں اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشا کا وقت۔ تیسری آیت میں قبلِ طلوعِ آفتاب سے مراد فجر اور قبلِ غروب سے مراد عصر۔ رات کی گھڑیوں میں مغرب اور عشاء دونوں شامل ہیں۔ اور دن کے کنارے تین ہیں، ایک صبح، دوسرے زوالِ آفتاب، تیسرے مغرب۔ اس طرح قرآن مجید مختلف مقامات پر نماز کے اُن پانچوں اوقات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن پر آج دنیا بھر کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض ان آیات کو پڑھ کر کوئی شخص بھی اوقاتِ نماز متعین نہ کر سکتا تھا جب تک کہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے معلمِ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود

اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے[۲۵]، اسی طرح تم لوگ بھی (حالتِ موت سے)

اپنے قول اور عمل سے اُن کی طرف رہنمائی نہ فرماتے۔

یہاں ذرا تھوڑی دیر ٹھیر کر منکرینِ حدیث کی اِس عبارت پر غور کیجیے کہ وہ "نماز پڑھنے" کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نماز جو آج مسلمان پڑھ رہے ہیں یہ سرے سے وہ چیز ہی نہیں ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ قرآن تو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، اور اس سے مراد نماز پڑھنا نہیں بلکہ "نظامِ ربوبیت" قائم کرنا ہے۔ اب ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ کونسا نرالا نظامِ ربوبیت ہے جسے یا تو طلوعِ آفتاب سے پہلے قائم کیا جا سکتا ہے یا پھر زوالِ آفتاب کے بعد سے کچھ رات گزرنے تک؟ اور وہ کونسا نظامِ ربوبیت ہے جو خاص جمعہ کے دن قائم کیا جانا مطلوب ہے؟ (اِذَا نُودِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ)۔ اور نظامِ ربوبیت کی آخر وہ کونسی خاص قسم ہے کہ اسے قائم کرنے کے لیے جب آدمی کھڑا ہو تو پہلے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھولے۔ اور سر پر مسح کر لے ورنہ وہ اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ...) اور نظامِ ربوبیت کے اندر آخر یہ کیا خصوصیت ہے کہ اگر آدمی حالتِ جنابت میں ہو تو جب تک وہ غسل نہ کرلے اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ ... وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا)۔ اور یہ کیا معاملہ ہے کہ اگر آدمی عورت کو چھو بیٹھا ہو اور پانی نہ ملے تو اس عجیب و غریب نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لیے اُسے پاک مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے اور منہ پر ملنا ہوگا؟ (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ مِّنْہُ)۔ اور یہ کیسا عجیب نظامِ ربوبیت ہے کہ اگر سفر پیش آجائے تو آدمی اسے پورا قائم کرنے کے بجائے آدھا ہی قائم کرے؟ (وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ)۔ پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ اگر جنگ کی حالت ہو تو فوج کے آدھے سپاہی ہتھیار لیے ہوئے امام کے پیچھے "نظامِ ربوبیت" قائم کرتے رہیں اور آدھے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہیں؟

سع نکال لیے جاؤ گے ع

اس کے بعد جب پہلا گروہ امام کے پیچھے " نظام ربوبیت قائم " کرتے ہوئے ایک سجدہ کرے تو وہ اٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے چلا جاتے ، اور دوسرا گروہ اس کی جگہ آکر امام کے پیچھے اس نظام ربوبیت کو قائم کرنا شروع کر دے (وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ) قرآن مجید کی یہ ساری آیات صاف بتا رہی ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد وہی نماز قائم کرنا ہے جو مسلمان دنیا بھر میں پڑھ رہے ہیں ، لیکن منکرین حدیث ہیں کہ خود بدلنے کے بجائے قرآن کو بدلنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بالکل ہی بے باک نہ ہو جائے وہ اس کے کلام کے ساتھ یہ مذاق نہیں کر سکتا جو یہ حضرات کر رہے ہیں یا پھر قرآن کے ساتھ یہ کھیل وہ شخص کھیل سکتا ہے جو اپنے دل میں اسے اللہ کا کلام نہ سمجھتا ہو اور محض دھوکا دینے کے لیے قرآن قرآن پکار کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہو ۔

۵۲ یعنی جو خدا ہر آن تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ کام کر رہا ہے وہ آخر انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی بخشنے سے عاجز کیسے ہو سکتا ہے ۔ وہ ہر وقت زندہ انسانوں اور حیوانات میں سے فضلات (WASTE MATTER) خارج کر رہا ہے جن کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔ وہ ہر لمحہ بے جان مادے (DEAD MATTER) کے اندر زندگی کی روح پھونک کر بے شمار جیتے جاگتے حیوانات ، نباتات اور انسان وجود میں لا رہا ہے ، حالانکہ بجائے خود اُن مادوں میں ، جن سے ان زندہ ہستیوں کے جسم مرکب ہوتے ہیں ، قطعاً کوئی زندگی نہیں ہوتی ۔ وہ ہر آن یہ منظر تمہیں دکھا رہا ہے کہ بنجر پڑی ہوئی زمین کو جہاں پانی میسر آیا اور یکایک وہ حیوانی اور نباتی زندگی کے خزانے اگلنی شروع کر دیتی ہے ۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا خدا انسان کے مر جانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہے تو حقیقت میں وہ عقل کا اندھا ہے ۔ اس کے سر کی آنکھیں جن ظاہری مناظر کو دیکھتی ہیں ، اس کی عقل کی آنکھیں ان کے اندر نظر آنے والے

اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔[۲۵]

روشن حقائق کو نہیں دیکھتیں۔

۲۴؎ خبردار رہنا چاہیے کہ یہاں سے تیسرے رکوع کے خاتمہ تک اللہ تعالیٰ کی جو نشانیاں بیان کی جا رہی ہیں وہ ایک طرف تو اوپر کے سلسلۂ کلام کی مناسبت سے حیاتِ اُخروی کے امکان و وقوع پر دلالت کرتی ہیں، اور دوسری طرف یہی نشانیاں اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ یہ کائنات نہ بے خدا ہے اور نہ اس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ صرف ایک خدا اس کا تنہا خالق، مدبّر، مالک اور فرمانروا ہے جس کے سوا انسانوں کا کوئی معبود نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ رکوع اپنے مضمون کے لحاظ سے تقریرِ ماسبق اور تقریرِ مابعد، دونوں کے ساتھ مربوط ہے۔

۲۵؎ یعنی انسان کا مادۂ تخلیق اس کے سوا کیا ہے کہ چند بے جان مادّے ہیں جو زمین میں پائے جاتے ہیں، مثلاً کچھ کاربن، کچھ کیلسیم، کچھ سوڈیم اور ایسے ہی چند اور عناصر۔ انہی کو ترکیب دے کر وہ حیرت انگیز ہستی بنا کھڑی کی گئی ہے جس کا نام انسان ہے اور اس کے اندر احساسات، جذبات، شعور، تعقّل اور تخیّل کی وہ عجیب قوتیں پیدا کر دی گئی ہیں جن میں سے کسی کا منبع بھی اس کے عناصر ترکیبی میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہی نہیں کہ ایک انسان اتفاقاً ایسا بن کھڑا ہوا ہو، بلکہ اس کے اندر وہ عجیب تولیدی قوت بھی پیدا کر دی گئی جس کی بدولت کروڑوں اور اربوں انسان وہی ساخت اور وہی صلاحیتیں لیے ہوئے بے شمار موروثی اور بے حد و حساب انفرادی خصوصیات کے حامل نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ کیا تمہاری عقل یہ گواہی دیتی ہے کہ یہ انتہائی حکیمانہ خلقت کسی صانع حکیم کی تخلیق کے بغیر آپ سے آپ ہو گئی ہے؟ کیا تم بحالتِ ہوش و حواس یہ کہہ سکتے ہو کہ تخلیقِ انسان جیسا عظیم الشان منصوبہ بنانا اور اس کو عمل میں لانا اور زمین و آسمان کی بے حد و حساب قوتوں کو انسانی زندگی کے لیے سازگار کر دینا بہت سے خداؤں کی فکر و تدبیر کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا تمہارا دماغ اپنی صحیح حالت میں ہوتا ہے جب تم یہ گمان کرتے ہو کہ جو خدا انسان کو خالص عدم سے وجود میں لایا ہے

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں[۲۸] تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو[۲۹] اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا

وہ اسی انسان کو موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟

۲۸۔ یعنی خالق کا کمالِ حکمت یہ ہے کہ اس نے انسان کی صرف ایک صنف نہیں بنائی، بلکہ اسے دو صنفوں (SEXES) کی شکل میں پیدا کیا جو انسانیت میں یکساں ہیں، جن کی بناوٹ کا بنیادی نارمولا بھی یکساں ہے، مگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف جسمانی ساخت، مختلف ذہنی و نفسی اوصاف، اور مختلف جذبات و داعیات لیکر پیدا ہوتی ہیں، اور پھر ان کے درمیان یہ حیرت انگیز مناسبت رکھ دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہے، ہر ایک کا جسم اور اس کے نفسیات و داعیات دوسرے کے جسمانی و نفسیاتی تقاضوں کا مکمل جواب ہیں۔ مزید براں وہ خالقِ حکیم اِن دونوں صنفوں کے افراد کو آغازِ آفرینش سے برابر اس تناسب کے ساتھ پیدا کیے چلا جا رہا ہے کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دنیا کی کسی قوم یا کسی خطۂ زمین میں صرف لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے ہوں، یا کہیں کسی قوم میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہوں۔ یہ ایسی چیز ہے جس میں کسی انسانی تدبیر کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان ذرہ برابر بھی نہ اس معاملہ میں اثر انداز ہو سکتا ہے کہ لڑکیاں مسلسل ایسی زنانہ خصوصیات اور لڑکے مسلسل ایسی مردانہ خصوصیات لیے ہوئے پیدا ہوتے رہیں جو ایک دوسرے کا ٹھیک جوڑ ہوں، اور نہ اِس معاملہ ہی میں اُس کے پاس اثر انداز ہونے کا کوئی ذریعہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی پیدائش اس طرح مسلسل ایک تناسب کے ساتھ ہوتی چلی جائے ہزارہا سال سے کروڑوں اور اربوں انسانوں کی پیدائش میں اس تدبیر و انتظام کا انتہے متناسب طریقے سے پیہم جاری رہنا اتفاقاً بھی نہیں ہو سکتا، اور یہ بہت سے خداؤں کی مشترک تدبیر کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز صریحاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ایک خالقِ حکیم، اور ایک ہی خالقِ حکیم نے اپنی غالب حکمت و قدرت سے ابتداءً مرد اور عورت کا ایک موزوں ترین ڈیزائن بنایا، پھر اس بات کا انتظام کیا کہ اس ڈیزائن کے مطابق بے حد و حساب مرد اور بے حد و حساب عورتیں اپنی الگ الگ انفرادی خصوصیات

کر دی[۲۹]۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

لیے ہوئے دنیا بھر میں ایک تناسب کے ساتھ پیدا ہوں۔

۲۹ یعنی یہ انتظام الل ٹپ نہیں ہو گیا ہے بلکہ بنانے والے نے بالارادہ اس غرض کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ مرد اپنی فطرت کے تقاضے عورت کے پاس، اور عورت اپنی فطرت کی مانگ مرد کے پاس پائے، اور دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر ہی سکون و اطمینان حاصل کریں۔ یہی وہ حکیمانہ تدبیر ہے جسے خالق نے ایک طرف انسانی نسل کے برقرار رہنے کا، اور دوسری طرف انسانی تہذیب و تمدن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر یہ دونوں صنفیں محض الگ الگ ڈیزائنوں کے ساتھ پیدا کر دی جاتیں اور ان میں وہ اضطراب نہ رکھ دیا جاتا جو ان کے باہمی اتصال و وابستگی کے بغیر متبدل بسکون نہیں ہو سکتا، تو انسانی نسل تو ممکن ہے کہ بھیڑ بکریوں کی طرح چل جاتی، لیکن کسی تہذیب و تمدن کے وجود میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمام انواع حیوانی کے برعکس نوع انسانی میں تہذیب و تمدن کے رونما ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ خالق نے اپنی حکمت سے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے وہ مانگ، وہ پیاس، وہ اضطراب کی کیفیت رکھ دی جسے سکون میسر نہیں آتا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جڑ کر نہ رہیں۔ یہی سکون کی طلب ہے جس نے انہیں مل کر گھر بنانے پر مجبور کیا۔ اسی کی بدولت خاندان اور قبیلے وجود میں آئے۔ اور اسی کی بدولت انسان کی زندگی میں تمدن کا نشوونما ہوا۔ اس نشوونما میں انسان کی ذہنی صلاحیتیں مددگار ضرور ہوئی ہیں مگر وہ اس کی اصلی محرک نہیں ہیں۔ اصل محرک یہی اضطراب ہے جسے مرد و عورت کے وجود میں ودیعت کر کے انہیں "گھر" کی تاسیس پر مجبور کر دیا گیا۔ کون صاحب عقل یہ سوچ سکتا ہے کہ دانائی کا یہ شاہکار فطرت کی اندھی طاقتوں سے محض اتفاقاً سرزد ہو گیا ہے؟ یا بہت سے خدا یہ انتظام کر سکتے تھے کہ اس گہرے حکیمانہ مقصد کو ملحوظ رکھ کر ہزارہا برس سے مسلسل بے شمار مردوں اور بے شمار عورتوں کو یہ خاص اضطراب لیے ہوئے پیدا کرتے چلے جائیں؟ یہ تو ایک حکیم اور ایک ہی حکیم کی حکمت کا صریح نشان ہے جسے صرف عقل کے اندھے ہی دیکھنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش[۳۱]، اور تمہاری زبانوں اور

۳۰ محبت سے مراد یہاں جنسی محبت (SEXUAL LOVE) ہے جو مرد اور عورت کے اندر جذبِ کشش کی ابتدائی محرک بنتی ہے اور پھر انہیں ایک دوسرے سے چسپاں کیے رکھتی ہے۔ اور رحمت سے مراد وہ روحانی تعلق ہے جو ازدواجی زندگی میں بتدریج ابھرتا ہے، جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ، ہمدرد و غم خوار اور شریک رنج و راحت بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب جنسی محبت پیچھے جا پڑتی ہے۔ اور بڑھاپے میں یہ جیون ساتھی کچھ جوانی سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کے حق میں رحیم و شفیق ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دو مثبت طاقتیں ہیں جو خالق نے اُس ابتدائی اضطراب کی مدد کے لیے انسان کے اندر پیدا کی ہیں جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ وہ اضطراب تو صرف سکون چاہتا ہے اور اس کی تلاش میں مرد و عورت کو ایک دوسرے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ دو طاقتیں آگے بڑھ کر ان کے درمیان مستقل رفاقت کا ایسا رشتہ جوڑ دیتی ہیں جو دو الگ ماحولوں میں پرورش پائے ہوئے اجنبیوں کو ملا کر کچھ اس طرح پیوستہ کرتا ہے کہ عمر بھر وہ زندگی کے منجدھار میں اپنی کشتی ایک ساتھ کھینچتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محبت و رحمت جس کا تجربہ کروڑوں انسانوں کو اپنی زندگی میں ہو رہا ہے، کوئی مادی چیز نہیں ہے جو وزن اور پیمائش میں آسکے، نہ انسانی جسم کے عناصرِ ترکیبی میں کہیں اس کے سر چشمے کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، نہ کسی لیبارٹری میں اس کی پیدائش اور اس کے نشو و نما کے اسباب کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ایک خالقِ حکیم نے بالارادہ ایک مقصد کے لیے پوری مناسبت کے ساتھ اسے نفسِ انسانی میں ودیعت کر دیا ہے۔

۳۱ یعنی اُن کا عدم سے وجود میں آنا، اور ایک اٹل ضابطے پر ان کا قائم ہونا، اور بے شمار قوتوں کا ان کے اندر انتہائی تناسب و توازن کے ساتھ کام کرنا، اپنے اندر اس بات کی بہت سی نشانیاں رکھتا ہے کہ اس پوری کائنات کو ایک ہی خالق اور ایک ہی خالق وجود میں لایا ہے، اور وہی اس عظیم الشان نظام کی تدبیر کر رہا ہے۔ ایک طرف اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ وہ ابتدائی قوت (ENERGY) کہاں سے

تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے^{۳۳}۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔

آئی جس نے مادے کی شکل اختیار کی، پھر مادے کے یہ بہت سے عناصر کیسے بنے، پھر ان عناصر کی اس قدر حکیمانہ ترکیب سے اتنی حیرت انگیز مناسبتوں کے ساتھ یہ مدہوش کن نظام عالم کیسے بن گیا، اور اب یہ نظام کروڑہا کروڑ صدیوں سے کس طرح ایک زبردست قانونِ فطرت کی بندش میں کسا ہوا چل رہا ہے، تو ہر غیر متعصب عقل اس نتیجے پر پہنچے گی کہ یہ سب کچھ کسی علیم و حکیم کے غالب ارادے کے بغیر محض بخت و اتفاق کے نتیجے میں نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری طرف اگر یہ دیکھا جائے کہ زمین سے لیکر کائنات کے بعید ترین سیاروں تک سب ایک ہی طرح کے عناصر سے مرکب ہیں اور ایک ہی قانونِ فطرت ان میں کارفرما ہے تو ہر عقل جو ہٹ دھرم نہیں ہے، بلاشبہ یہ تسلیم کرے گی کہ یہ سب کچھ بہت سے خداؤں کی خدائی کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا خالق اور رب ہے۔

۳۲؎ یعنی باوجودیکہ تمہارے قوائے نطقیہ یکساں ہیں، نہ منہ اور زبان کی ساخت میں کوئی فرق ہے اور نہ دماغ کی ساخت میں، مگر زمین کے مختلف خطوں میں تمہاری زبانیں مختلف ہیں، پھر ایک ہی زبان بولنے والے علاقوں میں شہر شہر اور بستی بستی کی بولیاں مختلف ہیں، اور مزید یہ کہ ہر شخص کا لہجہ اور تلفظ اور طرز گفتگو دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح تمہارا مادۂ تخلیق اور تمہاری بناوٹ کا فارمولا ایک ہی ہے، مگر تمہارے رنگ اس قدر مختلف ہیں کہ قوم اور قوم تو درکنار، ایک ماں باپ کے دو بیٹوں کا رنگ بھی بالکل یکساں نہیں ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف دو ہی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن اسی رُخ پر آگے بڑھ کر دیکھیے تو دنیا میں آپ ہر طرف اتنا تنوّع (VARIETY) پائیں گے کہ اس کا احاطہ مشکل ہو جائے گا۔ انسان، حیوان، نباتات اور دوسری تمام اشیاء کی جس نوع کو بھی آپ لے لیں اس کے افراد میں بنیادی یکسانی کے باوجود بے شمار اختلافات موجود ہیں، حتیٰ کہ کسی نوع کا بھی کوئی ایک فرد دوسرے سے بالکل مشابہ نہیں ہے، حتیٰ کہ ایک درخت کے دو پتوں میں بھی پوری مشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز صاف بتا رہی ہے کہ یہ دنیا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جس میں خودکار مشینیں چل رہی ہوں اور کثیر پیدا آوری (MASS PRODUCTION) کے طریقے پر ہر قسم کی اشیاء کا بس ایک ایک ٹھپہ ہو

اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔[۳۳] یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں

جس سے ڈھل ڈھل کر ایک ہی طرح کی چیزیں نکلتی چلی آرہی ہوں۔ بلکہ یہاں ایک ایسا زبردست کاریگر کام کر رہا ہے جو ہر ہر چیز کو پوری انفرادی توجہ کے ساتھ ایک نئے ڈیزائن، نئے نقش و نگار، نئے تناسب اور نئے اوصاف کے ساتھ بناتا ہے اور اس کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنی جگہ منفرد ہے۔ اس کی قوت ایجاد ہر آن ہر چیز کا ایک نیا ماڈل نکال رہی ہے، اور اس کی صناعی ایک ڈیزائن کو دوسری مرتبہ دُہرانا اپنے کمال کی توہین سمجھتی ہے۔ اس حیرت انگیز منظر کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر دیکھے گا وہ کبھی اس احمقانہ تصور میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا بنانے والا ایک دفعہ اس کارخانے کو چلا کر کہیں جا سویا ہے۔ یہ تو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ ہر وقت کارِ تخلیق میں لگا ہوا ہے اور اپنی خلق کی ایک ایک چیز پر انفرادی توجہ صرف کر رہا ہے۔

۳۳؎ فضل کو تلاش کرنے سے مراد رزق کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنا ہے۔ انسان اگرچہ بالعموم رات کو سوتا اور دن کو اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے، لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔ بہت سے انسان دن کو بھی سوتے اور رات کو بھی معاش کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسی لیے رات اور دن کا اکٹھا ذکر کر کے فرمایا کہ ان دونوں اوقات میں تم سوتے بھی ہو اور اپنی معاش کے لیے دوڑ دھوپ بھی کرتے ہو۔ یہ چیز بھی اُن نشانیوں میں سے ہے جو ایک خالقِ حکیم کی تدبیر کا پتہ دیتی ہیں۔ بلکہ مزید براں یہ چیز اس بات کی نشان دہی بھی کرتی ہے کہ وہ محض خالق ہی نہیں ہے بلکہ اپنی مخلوق پر غایت درجہ رحیم و شفیق اور اس کی ضروریات اور مصلحتوں کے لیے خود اس سے بڑھ کر فکر کرنے والا ہے۔ انسان دنیا میں مسلسل محنت نہیں کر سکتا بلکہ ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے چند گھنٹوں کے لیے آرام درکار ہوتا ہے تاکہ پھر چند گھنٹے محنت کرنے کے لیے اسے قوت بہم پہنچ جائے۔ اس غرض کے لیے خالقِ حکیم و رحیم نے انسان کے اندر صرف تکان کا احساس، اور صرف آرام کی خواہش پیدا کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے "نیند" کا ایک ایسا زبردست داعیہ اس کے وجود میں رکھ دیا جو اس کے ارادے کے

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی[۴۳] اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی

بغیر، حتیٰ کہ اس کی مزاحمت کے باوجود، خود بخود ہر چند گھنٹوں کی بیداری و محنت کے بعد اُسے آدبوچتا ہے اور چند گھنٹے آرام لینے پر اس کو مجبور کر دیتا ہے۔ اس نیند کی ماہیت و کیفیت اور اس کے حقیقی اسباب کو آج تک انسان نہیں سمجھ سکا ہے۔ یہ قطعاً ایک پیدائشی داعیہ ہے جو آدمی کی فطرت اور اس کی ساخت میں رکھ دیا گیا ہے۔ وہ صریحاً اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کے رکھ دینے میں ایک بڑی حکمت و مصلحت اور مقصدیت کار فرما ہے۔ اور وہ اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جس نے یہ چیز انسان کے اندر رکھی ہے وہ اُس کے حق میں خود اس سے بڑھ کر خیر خواہ ہے، ورنہ انسان بالارادہ نیند کی مزاحمت کر کے اور زبردستی جاگ جاگ کر اور مسلسل کام کر کر کے اپنی قوتِ کار کو ہی نہیں، قوتِ حیات تک کو ختم کر ڈالتا۔

پھر رزق کی تلاش کے لیے "اللہ کے فضل کی تلاش" کا لفظ استعمال کر کے نشانیوں کے ایک دوسرے سلسلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آدمی آخر یہ رزق تلاش ہی کہاں کر سکتا تھا اگر زمین و آسمان کی بے حد حساب طاقتوں کو رزق کے اسباب و ذرائع پیدا کرنے میں نہ لگا دیا گیا ہوتا، اور زمین میں انسان کے لیے رزق کے بے شمار ذرائع نہ پیدا کر دیے گئے ہوتے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ رزق کی یہ تلاش اور اس کا اکتساب اُس صورت میں بھی ممکن نہ ہوتا اگر انسان کو اس کام کے لیے مناسب ترین اعضاء اور مناسب ترین جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں نہ دی گئی ہوتیں۔ پس آدمی کے اندر تلاشِ رزق کی قابلیت اور اس کے وجود سے باہر وسائلِ رزق کی موجودگی صاف صاف ایک ربِ رحیم و کریم کے وجود کا پتہ دیتی ہے۔ جو عقل بیمار نہ ہو وہ کبھی یہ فرض نہیں کر سکتی کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا ہے، یا یہ بہت سے خداؤں کی خدائی کا کرشمہ ہے، یا کوئی بے درد اندھی قوت اِس فضل و کرم کی ذمہ دار ہے۔

۴۳ ؎ یعنی اس کی گرج اور چمک سے امید بھی بندھتی ہے کہ بارش ہوگی اور فصلیں تیار ہوں گی، مگر ساتھ ہی خوف بھی لاحق ہوتا ہے کہ کہیں بجلی نہ گر پڑے یا ایسی طوفانی بارش نہ ہو جائے جو سب کچھ بہا لے جائے۔

موت کے بعد زندگی بخشتا ہے[۳۵]۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں[۳۶]۔ پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا، بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے[۳۷]۔ آسمانوں

---

[۳۵] یہ چیز ایک طرف حیات بعد الموت کی نشاندہی کرتی ہے، اور دوسری طرف یہی چیز اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ خدا ہے اور زمین و آسمان کی تدبیر کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ زمین کی بے شمار مخلوقات کے رزق کا انحصار اُس پیداوار پر ہے جو زمین سے نکلتی ہے۔ اس پیداوار کا انحصار زمین کی صلاحیت بارآوری پر ہے۔ اس صلاحیت کے روبکار آنے کا انحصار بارش پر ہے، خواہ وہ براہ راست زمین پر برسے، یا اس کے ذخیرے سطح زمین پر جمع ہوں، یا زیر زمین چشموں اور کنوؤں کی شکل اختیار کریں یا پہاڑوں پر یخ بستہ ہو کر دریاؤں کی شکل میں بہیں۔ پھر اس بارش کا انحصار سورج کی گرمی پر، موسموں کے ردّوبدل پر، فضا کی حرارت و برودت پر، ہواؤں کی گردش پر، اور اس بجلی پر ہے جو بادلوں سے بارش برسنے کی محرک بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بارش کے پانی میں ایک طرح کی قدرتی کھاد بھی شامل کر دیتی ہے۔ زمین سے لیکر آسمان تک کی ان تمام مختلف چیزوں کے درمیان یہ ربط اور مناسبتیں قائم ہونا، پھر ان سب کا بے شمار مختلف النوع مقاصد اور مصلحتوں کے لیے صریحاً سازگار ہونا، اور ہزاروں لاکھوں برس تک ان کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل سازگاری کرتے چلے جانا، کیا یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کسی صانع کی حکمت اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کی غالب تدبیر کے بغیر ہو گیا ہے؟ اور کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ زمین، سورج، ہوا، پانی، حرارت، برودت، اور زمین کی مخلوقات کا خالق اور رب ایک ہی ہے؟

[۳۶] یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے حکم سے ایک دفعہ وجود میں آ گئے ہیں، بلکہ ان کا مسلسل قائم رہنا اور ان کے اندر ایک عظیم الشان کارگاہ ہستی کا پیہم چلتے رہنا بھی اسی کے حکم کی بدولت ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اگر اس کا حکم انہیں برقرار نہ رکھے تو یہ سارا نظام یک لخت درہم برہم ہو جائے۔

اور زمین میں جو بھی ہیں اُس کے بندے ہیں، سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے^٣٨^ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے ع

وہ تمہیں^٣٩^ خود تمہاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمہارے اُن غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیئے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو؟^٤٠^ — اس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے

---

^٣٧^ یعنی کائنات کے خالق و مدبر کے لیے تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا کوئی ایسا بڑا کام نہیں ہے کہ اسے اس کے لیے بہت بڑی تیاریاں کرنی ہوں گی، بلکہ اس کی صرف ایک پکار اس کے لیے بالکل کافی ہوگی کہ آغاز آفرینش سے آج تک جتنے انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور آئندہ پیدا ہوں گے وہ سب ایک ساتھ زمین کے ہر گوشے سے نکل کھڑے ہوں۔

^٣٨^ یعنی پہلی مرتبہ پیدا کرنا اگر اُس کے لیے مشکل نہ تھا، تو آخر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا پہلی مرتبہ کی پیدائش میں تو تم خود جیتے جاگتے موجود ہو۔ اس لیے اس کا مشکل نہ ہونا تو ظاہر ہے۔ اب یہ بالکل سیدھی سادھی عقل کی بات ہے کہ ایک دفعہ جس نے کسی چیز کو بنایا ہو اس کے لیے وہی چیز دوبارہ بنانا نسبتہً زیادہ ہی آسان ہونا چاہیے۔

^٣٩^ یہاں تک توحید اور آخرت کا بیان ملا جلا چل رہا تھا۔ اس میں جن نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان کے اندر توحید کے دلائل بھی ہیں اور وہی دلائل یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ آخرت کا آنا غیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے خالص توحید پر کلام شروع ہو رہا ہے۔

^٤٠^ مشرکین یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ زمین و آسمان اور اس کی سب چیزوں کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس کی مخلوقات میں سے بعض کو خدائی صفات و اختیارات میں اس کا شریک ٹھیراتے تھے، اور ان سے دعائیں مانگتے، ان کے آگے نذریں اور نیازیں پیش کرتے، اور مراسم عبودیت بجا لاتے تھے۔

جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ مگر یہ ظالم بے سمجھے بوجھے اپنے تخیلات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب کون اُس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو؟[۴۴] ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

ان بناوٹی شریکوں کے بارے میں ان کا اصل عقیدہ اُس تلبیہ کے الفاظ میں ہم کو ملتا ہے جو وہ خانۂ کعبہ کا طواف کرتے وقت زبان سے ادا کرتے تھے۔ وہ اس موقع پر کہتے تھے: لبیک اللھم لبیک لا شریک لک الا شریکا ھو لک تملکہ وما ملک (طبرانی عن ابن عباس)۔ "میں حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اُس شریک کے جو تیرا اپنا ہے، تو اُس کا بھی مالک ہے اور جو کچھ اُس کی ملکیت ہے اس کا بھی تو مالک ہے"۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی شرک کی تردید فرما رہا ہے۔ تمثیل کا منشا یہ ہے کہ خدا کے دیئے ہوئے مال میں خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے وہ انسان جو اتفاقاً تمہاری غلامی میں آ گئے ہیں، تمہارے تو شریک نہیں قرار پا سکتے، مگر تم نے یہ عجیب دھاندلی مچا رکھی ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں خدا کی پیدا کردہ مخلوق کو بے تکلف اس کے ساتھ خدائی کا شریک ٹھیراتے ہو۔ اس طرح کی احمقانہ باتیں سوچتے ہوئے آخر تمہاری عقل کہاں ماری جاتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۵۴-۵۵۵)

[۴۴] یعنی جب کوئی شخص سیدھی سیدھی عقل کی بات نہ خود سوچے اور نہ کسی کے سمجھانے سے سمجھنے کے لیے تیار ہو تو پھر اس کی عقل پر اللہ کی پھٹکار پڑ جاتی ہے اور اس کے بعد ہر وہ چیز جو کسی معقول آدمی کو حق بات تک پہنچنے میں مدد دے سکتی ہے، وہ اس ضدی جہالت پسند انسان کو الٹی مزید گمراہی میں مبتلا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی کیفیت ہے جسے "بھٹکانے" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ راستی پسند انسان جب اللہ سے ہدایت کی توفیق طلب کرتا ہے تو اللہ اس کی طلبِ صادق کے مطابق اس کے لیے زیادہ سے زیادہ اسبابِ ہدایت پیدا فرما دیتا ہے۔ اور گمراہی پسند انسان جب گمراہ ہی ہونے پر اصرار کرتا ہے تو پھر اللہ اس کے لیے وہی اسباب پیدا کرتا چلا جاتا ہے جو اسے بھٹکا کر روز بروز حق سے دُور لیے چلے جاتے ہیں۔

ارض القرآن کا سفر

از جناب محمد عاصم صاحب

(۶)

نجد کی عامی زبان ہمارا دوپہر کا کھانا ریاض کے ایک تاجر شیخ محمد بن عبدالرحمٰن الشویعر کے ہاں تھا۔ بیچاروں نے بڑا اہتمام کیا تھا، مگر دوسرے تمام حضرات نے ایک دوسری جگہ دعوت کی وجہ سے معذرت کر دی تھی۔ استاذ عبدالحکیم عابدین اسی روز اسی وقت ہوائی جہاز سے جدہ روانہ ہو رہے تھے۔ بارش بھی ہو رہی تھی، اس لیے دعوت میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔ شیخ شویعر کے ساتھ افہام و تفہیم میں ہمیں جو دقت پیش آئی، وہ یاد ہی رہے گی۔ اب تک ہمارا واسطہ یا تو شیوخ سے پڑا تھا یا کلیۃ الشریعہ کے طلبہ و اساتذہ سے، اور یہ سب فصیح زبان بولتے تھے۔ اس لیے ان سے افہام و تفہیم میں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ شیخ شویعر کی زبان میں ایک تو لکنت تھی، دوسرے وہ نجد کی ٹھیٹھ عامی زبان استعمال کر رہے تھے ہم نے ان سے عرض بھی کیا کہ ہم عامی زبان سمجھ نہیں سکتے، مگر شاید وہ بھی ہماری بات نہ سمجھ سکے یگھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو میں سوائے اس کے کہ ہم ان کی باتوں کا ہاں یا نہ میں جواب دیتے رہیں، ان سے کوئی گفتگو نہ کر سکے۔ نجد و حجاز کی عامی زبان اگرچہ مصر، شام، عراق اور اردن کے مقابلے میں بڑی حد تک قابلِ فہم اور اقرب الی الفصحیٰ ہے، مگر پھر بھی اس کا اس وقت تک پوری طرح سمجھنا مشکل ہے، جب تک آدمی چند ماہ وہاں رہ نہ لے۔

مغرب کی نماز کے بعد ہم شیخ عبداللہ المشعری کے ہاں کھانے پر گئے۔ وہاں ان کے دوست استاذ سعید العبدول سے بھی ملاقات ہوئی، جو مکّہ کے ہائی سکول المعہد العلمی السعودی کے انچارج ہیں۔ ان دنوں اپنے ایک کام کے سلسلے میں ریاض آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑی دیر تک

ریاض اور مکہ معظمہ کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دین سے غفلت بلکہ بے راہ روی و بے زاری کی شکایت کرتے رہے۔

شاہ سعود کی مہمان نوازی عشاء کے بعد شیخ عبدالعزیز بن باز ہوٹل تشریف لائے۔ دن میں ان کے نام دمام سے شاہ سعود کا ایک تار آیا تھا جس کے ذریعہ سے انہوں نے اپنے ذاتی مصارف کی مد سے ہمارے سفر خرچ کے لیے تین ہزار ریال (تقریباً چار ہزار روپے) بھیجے تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالعزیز اس وقت یہ رقم لے کر تشریف لائے تھے۔ ہم نے اسی وقت شاہ سعود کے نام شکریہ کا تار لکھ کر روانہ کر دیا۔ یہ صرف شیخ اور شاہ کے اخلاقِ کریمانہ کا کرشمہ تھا۔ ورنہ ہماری طرف سے کبھی اشارۃً و کنایۃً بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہ ہوا تھا۔ ہم تو اس سفر میں صرف انتظامی سہولتیں چاہتے تھے۔

اگلے دن (۷ ارنومبر) جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز سے کچھ پہلے شیخ مناع القطان ہوٹل تشریف لائے اور ہمیں ساتھ لے کر شرکۃ المبانی المصریہ لے گئے، جو نئی عمارتیں تعمیر کرنے والی ایک کمپنی ہے۔ اس کے مدیر (انچارج) استاذ عبدالعظیم اور عادل مصری ہیں۔ ان کا تعلق بھی اخوان سے تھا اور اسی وجہ سے انقلاب کے بعد مصر سے ریاض آگئے تھے۔ کمپنی کے احاطہ میں ایک چھوٹی مگر خوبصورت مسجد ہے، جس میں زیادہ تر کمپنی ہی کے مزدور اور ملازمین نماز پڑھتے ہیں۔ شیخ مناع القطان نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز پڑھائی۔ بارش کی مناسبت سے خطبہ کا موضوع یہ تھا کہ جس طرح انسان کو روئے زمین پر زندہ رہنے کے لیے بارش کی ضرورت ہے، اسی طرح اسے مہذب اور امن و امان کی زندگی بسر کرنے کے لیے دین کی بھی ضرورت ہے۔ خطبہ نہایت ہی مؤثر اور فصیح زبان میں تھا۔ مصری علماء کی تقریر کی زبان یوں بھی فصیح ہوتی ہے لیکن جس شخص نے حسن البناء شہیدؒ کی صحبت بھی پائی ہو اس کی زبان میں فصاحت کے ساتھ سوز اور اخلاص کی بھی آمیزش ہو جاتی ہے۔

۳ بجے شیخ عبداللطیف کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی، اس لیے نماز کے بعد

ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ واپسی پر شیخ نے مولانا کو اور مجھے بہت سی کتابوں کا تحفہ دیا۔ افسوس چودھری صاحب کی طبیعت اس روز اچھی نہیں تھی اور وہ ہمارے ساتھ دعوت میں نہ جا سکے تھے، اس لیے کتابوں کے تحفہ سے محروم رہے۔

ریاض اور مکہ کے درمیان ذرائع آمدورفت ہمیں اپنے پروگرام اور ارادے کے خلاف ریاض میں کئی دن زیادہ لگ گئے تھے، اس لیے اب ہم جلد از جلد یہاں سے مکہ معظمہ روانہ ہونا چاہتے تھے۔ ریاض سے جدہ اگرچہ ہوائی جہاز بھی جاتے ہیں، لیکن ظہران سے روانہ ہوتے وقت ہمارے ذہن میں یہی تھا کہ ہم ریاض سے کوئی ٹیکسی لے لیں گے اور اسی سے مکہ معظمہ جائیں گے کیونکہ ہم اس ملک میں محض گزر جانے کے لیے نہیں بلکہ ملک اور اس کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ مگر ریاض میں معلوم ہوا کہ یہاں سے مکہ معظمہ تک کوئی پختہ سڑک نہیں ہے۔ اور راستے میں کہیں سخت پتھریلی جگہ آتی ہے اور کہیں سخت ریتلی، اس لیے چھوٹی گاڑی کا تو سوال ہی نہیں، کوئی بڑی گاڑی بھی مسافروں کو لے کر نہیں جاتی۔ صرف باربرداری کے ٹرک آتے جاتے ہیں، جو عموماً تین دن اور چار راتوں میں ریاض سے مکہ معظمہ یا مکہ معظمہ سے ریاض پہنچتے ہیں یہی ٹرک سامان کے ساتھ مسافروں کو بھی لے جاتے ہیں اور عموماً ۵۰ ریال (۵۲ روپے) فی کس کرایہ وصول کرتے ہیں مقامات کو دیکھنے کے خیال سے ارادہ ہوا کہ کسی ٹرک ہی کے ذریعے سفر کر لیا جائے لیکن معلوم ہوا کہ یہ ٹرک عموماً رات کو چلتے اور دن میں کسی جگہ ٹھہرے رہتے ہیں، اس لیے ان کے ذریعے راستے میں کسی مقام کا دیکھنا ممکن نہیں۔ پھر ریاض اور مکہ معظمہ کے درمیان سوائے طائف کے کوئی ایسا تاریخی مقام بھی نہیں ہے جس کا ہمارے مقصدِ سفر سے براہِ راست تعلق ہو، کیونکہ ہم تو صرف ان مقامات کو دیکھنا چاہتے تھے، جن کا تعلق یا قرآن پاک سے ہے۔ یا سیرتِ پاک سے۔ علاوہ ازیں ان دنوں بارش کی وجہ سے راستہ اور بھی خراب ہو گیا تھا اور کوئی ٹرک آجا نہیں رہا تھا۔ ٹرک کے ذریعے سفر کرنے کے لیے لازماً ہمیں دو تین دن اور ریاض میں رکنا پڑتا، اس لیے احباب اور ملنے والوں کے مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ خود ہوائی جہاز

کے ذریعے جدہ روانہ ہوا جائے اور پھر وہاں سے مکہ معظمہ اور طائف جایا جائے، اور اپنا بھاری سامان کسی ٹرک کے ذریعے مکہ معظمہ بھیج دیا جائے۔ مگر اس میں بھی یہ مشکل سامنے آئی کہ کوئی ٹرک والا اس وقت تک سامان لے جانے کے لیے تیار نہ تھا، جب تک اس کا مالک اس کے ساتھ نہ ہو۔ مجبوراً یہ طے کیا گیا کہ کتابیں تو ظہران بھیج دی جائیں تاکہ وہاں سے ان کو پاکستان روانہ کر دیا جائے اور ہم نے اپنے ساتھ کا سامان لیکر ہوائی جہاز پر جدہ چلے جائیں۔ اس غرض کے لیے میں ہوائی جہاز کا وقت اور کرایہ معلوم کرنے کے لیے ہوائی اڈہ گیا۔ وہاں یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ ریاض سے جدہ تک ہوائی جہاز کا کرایہ ایک سعودی باشندے کے لیے سو ریال اور غیر سعودی مسافر کے لیے دو سو ریال ہے۔ معلوم نہیں یہ سعودی باشندوں کے لیے رعایت ہے یا غیر سعودی مسافروں پر جرمانہ؟ ہمارے لیے قومیت کے لحاظ سے کرایوں کے فرق کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اپنے ملک میں ہمیں کبھی اس کا تصور بھی نہ ہوا تھا۔

عصر اور مغرب کے درمیان ہم شیخ عبدالرزاق عفیفی کے ہاں گئے۔ وہاں ان کے بہت سے سلفی احباب موجود تھے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہمارا پروگرام اس سفر میں مصر جانے کا بھی ہے تو انہوں نے ہمیں قاہرہ اور اسکندریہ کے بہت سے سلفی حضرات کے پتے دیئے تاکہ وہاں پہنچ کر ان سے ملاقات کر سکیں۔

ایک دلچسپ انکشاف مغرب کے بعد ہوٹل واپس پہنچے تو وہاں ملاقات کے لیے آئے ہوئے حضرات کا ایک ہجوم موجود تھا جس نے رات گئے تک ہمیں یہ موقع ہی نہیں دیا کہ ہم کسی اور جگہ جا سکتے۔ آنے والے حضرات میں ایک صاحب جو دراصل ہندوستانی تھے لیکن اب آٹھ دس سال سے سعودی مملکت ہی میں رہ رہے ہیں، مکہ معظمہ کے روزنامہ الندوۃ کے نمائندہ بھی تھے۔ بہت عمدہ اردو بول رہے تھے۔ انہوں نے مولانا سے اپنے اخبار کے لیے انٹرویو لیتے ہوئے مقصد سفر کے متعلق چند سوالات کیے۔ ان سوالات میں ان کا ایک سوال "حدیث اور فقہ کے متعلق مولانا کی رائے" کے بارے میں بھی تھا۔ اس سوال کی جو وجہ

انہوں نے بتائی وہ بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ شاید قارئین کو اس کے سننے پر یقین نہ آئے جیسا کہ اس کے پہلی بار سننے پر ہمیں بھی یقین نہ آیا تھا لیکن جب نمائندۂ الندوہ نے بار بار یقین دلایا تو کم از کم ہم ان کے اس بیان کو غلط قرار نہ دے سکے۔ انہوں نے بتایا کہ ۵۸ء کے حج سے پیشتر مصر کے ایک پرچہ میں یہ شائع ہوا کہ مولانا مودودی حدیث اور فقہ کے منکر ہیں۔ اس کے بعد جب اسی سال لائل پور اور لاہور کے دو عالم ۔ جن کا پہلے جماعت اسلامی سے تعلق تھا ۔ حج کے لیے تشریف لائے، اور ان سے اس کے متعلق سوال کیا گیا، تو ان دونوں نے اس کی تائید کی۔ کلیۃ الشریعہ کے جو طلبہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے لائل پور ہی کے ایک اور صاحب کے متعلق (جو پہلے ریاض کے کلیۃ الشریعہ میں طالب علم تھے اور ہماری ریاض میں موجودگی سے پیشتر پاکستان واپس آگئے تھے) بتایا کہ انہوں نے مولانا مودودی کو بدنام کرنے کے لیے ریاض میں باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی اور علماء کو مولانا کے خلاف بھڑکانے کے لیے انہوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ۵۶ء میں حج سے واپسی پر مولانا نے اپنے سفر نامہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی قبروں کے قبے گرانے پر سعودی حکومت کی مذمت کی ہے اور اسے سخت برا بھلا کہا ہے ع

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

جدہ کے لیے روانگی اگلے دن (۲۸ نومبر) ہمیں ریاض سے روانہ ہونا تھا اس شہر کے شیوخ و عمائد نے جس اخلاص و محبت کا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ روانہ ہونے سے پہلے ہم ان سے الوداعی ملاقات کرتے لیکن بارش کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا۔ اس کے باوجود مولانا امیر عبداللہ سے ملنے کے لیے گئے۔ اس ملاقات میں امیر عبداللہ نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ ہمیں ذاتی طور پر ایک موٹر مکینک، ایک درزی اور ایک مالی کی ضرورت ہے، اگر یہ تینوں آدمی پاکستان سے مہیا ہو سکیں تو بہت اچھا ہے۔" مولانا نے واپسی کے بعد کوشش کرنے کا وعدہ فرمایا۔

پاکستانی سفیر کا ٹیلیفون ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت ۱۲ بجے دوپہر تھا۔ ۱۱ بجے کے قریب ہم ہوٹل سے اپنا سامان نکلوا رہے تھے کہ جدہ سے ہمارے نام پاکستانی سفیر چودھری علی اکبر خاں صاحب کا ٹیلیفون آیا جس میں انہوں نے ہمیں باصرار دعوت دی کہ جدہ آئیں تو ان ہی کے ہاں قیام کریں۔ انہوں نے جس محبت اور اخلاق سے یہ دعوت دی، اس کے پیش نظر ہمارے لیے اسے رد کرنا مشکل تھا۔

ہم ہوائی اڈہ پہنچے تو شرکۃ المیانی المصریہ کے مدیر استاذ عبدالعظیم اور بعض دوسرے احباب الوداعی ملاقات کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور سامان کا وزن کرایا۔ ۳۰ کیلو فی کس سامان لے جانے کی اجازت تھی، اس طرح ہم کل ۹۰ کیلو سامان مفت لے جا سکتے تھے، لیکن ہمارے سامان کا کل وزن ۱۸۷ کیلو ہوا۔ زائد سامان یعنی ۹۷ کیلو کا کرایہ اپنے ساتھ رکھنے کی صورت میں ۱۹۴ ریال اور ہوائی جہاز کے گودام میں رکھنے کی صورت میں ۹۷ ریال بنتا تھا۔ ہمیں بہر حال یہ کرایہ دینا ہی تھا اور ہم اس کے لیے تیار تھے لیکن جب ہوائی اڈے والوں کو مولانا کی شخصیت کا علم ہوا تو انہوں نے بطور مہمان نوازی ہم سے زائد سامان کا کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ سعودی عرب کے سوا اس مہمان نوازی کا تصور آدمی اور کہاں کر سکتا ہے؟

اس روز ہوائی جہاز لیٹ تھا۔ تقریباً عصر کے وقت ہم ریاض سے جدہ روانہ ہوئے۔

جدہ وصولی ریاض اور جدہ کے درمیان تقریباً ۶۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔ جہاز میں بیٹھے ہوئے چاروں طرف، بلکہ اوپر اور نیچے بھی بادل ہی بادل نظر آ رہے تھے۔ جہاز کبھی بادلوں کے اوپر سے گزرتا، کبھی نیچے اور کبھی ان کے درمیان سے۔ دور سے بادلوں کے ٹکڑے بالکل دھنی ہوئی سفید اور چمکدار روئی کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ ہوائی جہاز سے بادلوں کا منظر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے یہ منظر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جا کر مطلع صاف ہوا اور نیچے سے زمین نظر آنے لگی۔ مغرب کے وقت ہم جدہ کے

ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے۔ اڈے پر چودھری علی اکبر خاں صاحب اور استاذ عبدالحکیم عابدین موجود تھے۔ ان کے ساتھ پاکستان کے ماسٹر عبدالحکیم صاحب بھی تھے جو ضلع لائل پور کے رہنے والے ہیں اور آج کل پاکستانی سفارت خانہ کے قائم کردہ ایک مدرسہ میں تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جہاز سے اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں بھی جہاز کے سامان کی تلاشی لی جائیگی کیونکہ ہمارا جہاز دراصل بیروت سے آرہا تھا۔ دوسرے مسافروں کی تو تلاشی ہوئی مگر ہمارا سامان کو یونہی چھوڑ دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ رعایت ہمارے ساتھ ہوئی ہو، اور ممکن ہے کہ ریاض سے آنے والے تمام مسافروں کو تلاشی سے معاف رکھا گیا ہو۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم چودھری علی اکبر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ جدّہ میں پاکستانی سفارت خانہ تو شہر کے اندر ہے، لیکن چودھری صاحب کی قیام گاہ شہر سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک نئی آبادی میں اس سڑک پر ہے جو جدہ سے مدینہ منورہ جاتی ہے۔

ریاض میں گذشتہ کئی دنوں سے بارش کا سلسلہ جاری تھا اس لیے وہاں سردی اچھی خاصی ہو گئی تھی اور ہم نے اپنے گرم کپڑے نکال کر پہن لیے تھے۔ لیکن جدہ پہنچتے ہی گرم کپڑوں نے کاٹھنا شروع کر دیا۔ وہاں ہمارے ہاں کے اپریل کا سا موسم تھا۔ معلوم ہوا کہ جدہ کی زیادہ سے زیادہ سردی بس اتنی سی ہے۔

اسی رات چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ہاں مولانا کے اعزاز میں ایک پر تکلف اور شاندار دعوت کا انتظام تھا جس میں انہوں نے جدّہ کے بہت سے عرب تجار، پاکستانی حضرات اور اردن، ہندوستان اور بعض دوسرے ملکوں کے سفراء کو بھی بلایا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک مختلف موضوعوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک مصری ڈاکٹر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے جو عرب قوم پرستی کی حمایت، نحاس پاشا کی تعریف اور حسن البنا شہید کی مذمت فرما رہے تھے۔ چودھری غلام محمد صاحب ان کی باتوں پر صبر نہ کر سکے اور کافی دیر تک بحث رہی۔ اس دعوت میں جن پاکستانی حضرات سے شرفِ نیاز حاصل ہوا ان میں جناب انور علی صاحب بھی تھے جو

آج کل سعودی اسٹیٹ بنک کے گورنر ہیں اور جنھوں نے سعودی حکومت کے مالیات کو سنبھالنے میں نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

ہمارا ارادہ جدہ میں قیام کا نہ تھا۔ اصل مقصود مکہ معظمہ تھا، تاہم جدہ میں بھی بعض ایسے کام تھے جن کے لیے وہاں رکنا ضروری تھا۔

اگلے دن (۲۹ نومبر ۵۹ء) علی الصباح ہم چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ساتھ پاکستانی سفارت خانہ آئے اور اپنے پاسپورٹوں پر کویت، یمن اور بعض دوسرے ممالک کا مزید اندراج کرایا۔ کویت کے احباب کا اصرار تھا کہ سفر کا پروگرام اس طرح بنایا جائے کہ مصر و شام کے سفر کے بعد ہم لوگ کویت ضرور پہنچیں۔ یمن کے سفر کی بھی کوئی صورت نکل آنے کا امکان تھا، اس لیے پاسپورٹوں پر ان ممالک کا مزید اندراج ضروری تھا۔

مصری سفارت خانہ اس کے بعد چودھری علی اکبر خاں صاحب ہی کے ساتھ جمہوریہ عربیہ متحدہ کے سفارت خانہ آئے۔ جمہوریہ کا ویزا تو ہمارے پاس تھا، لیکن ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں مصر پہنچ جانے کے بعد جزیرہ نمائے سینا کے داخلہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آجائے، کیونکہ یہ علاقہ فوجی ہے اور وہاں حکومت کی خاص اجازت کے بغیر داخلہ نہیں ہو سکتا۔ سفیر نے ہمارے نام اور پیشے لکھے اور یہ کہ کس غرض سے جزیرہ نمائے سینا جانا چاہتے ہیں۔ مصر میں جن لوگوں سے ہمیں ملنا تھا، ان کے نام بھی دریافت کیے اور پھر وعدہ کیا کہ اپنی حکومت کو لکھ کر معلوم کریں گے اور پھر ہمیں اطلاع دیں گے۔

مصری سفیر بڑے ہی پُر تکلف لہجے میں گفتگو کرتے رہے۔ غالباً تکلف کی وجہ یہ تھی کہ ہم سے ان کو مجبوراً فصیح عربی میں کلام کرنا پڑا۔ عام طور پر عرب ممالک کے تعلیم یافتہ لوگ بھی بے تکلف گفتگو عامی زبان ہی میں کرتے ہیں اور مسلسل فصیح زبان بولنے کی نوبت آجائے تو انہیں خاصی مشقت کرنی ہوتی ہے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے اس بات پر بار بار زور دیا کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور یہ کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ بات ہمارے لیے قابلِ قدر تھی۔ مگر مصر میں قومیت کے تین تصورات بیک وقت چل رہے ہیں مصر کے اندر فرعونی تہذیب کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں عرب قومیت کی علمبرداری کی جاتی ہے اور غیر عرب مسلمانوں کے سامنے اسلامی برادری کا ذکر اچھے خاصے جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد نصیف مصری سفارت خانہ سے فارغ ہو کر ہم شیخ محمد نصیف کے ہاں انہیں سلام کرنے اور ان کی مزاج پرسی کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ شیخ محمد نصیف نہ صرف جدہ بلکہ پورے حجاز میں ممتاز ترین آدمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم، دولت، حسنِ اخلاق، تواضع ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ دنیا بھر کے علماء اور اہلِ علم حضرات سے ان کے تعلقات ہیں۔ باہر سے حج کے لیے آنے والے تمام علم دوست حضرات جدہ میں انہی کے ہاں قیام کرتے ہیں۔ ان کا گھر گویا دنیا بھر کے اہلِ علم کے لیے عام مہمان خانہ ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ نہایت شاندار اور وسیع ہے اور مقامی شائقین کے لیے اس کی حیثیت پبلک لائبریری کی ہے۔ عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے سلفی ہیں لیکن مزاج میں بہت ہی اعتدال ہے۔ متقدمین علماء کی کتابیں چھپوا کر دنیا بھر کے اہلِ علم کو وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں مولانا مسعود عالم صاحب کا قیام بھی ان ہی کے ہاں ہوا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں مولانا مودودی بھی ان ہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اب بھی ہم ان ہی کے ہاں قیام کرتے، لیکن چودھری علی اکبر خاں صاحب کی مہمان نوازی نے ہمیں اپنے ہاں کھینچ لیا۔ شیخ نصیف صاحب اپنی روایاتی محبت اور حسنِ اخلاق سے پیش آئے۔ انہیں اس بات کا افسوس تو ہوا کہ اب کی مرتبہ ہم ان کے ہاں قیام نہ کر سکے، لیکن چودھری علی اکبر خاں صاحب کی وجہ سے اس کا اظہار نہ کر سکے۔ صرف اتنا کہا کہ "سفیر صاحب کا حق مقدم تھا"۔ معلوم ہوا کہ ان کی آنکھیں خراب ہو گئی تھیں، جن کے علاج کے لیے وہ مصر گئے تھے اور ابھی چند دن پہلے وہاں سے واپس آئے تھے۔ اب بھی انہیں مکمل آرام نہ ہوا تھا۔

واپسی پر شیخ نصیف نے اپنی عادت کے مطابق چند کتابیں مولانا کو بطورِ ہدیہ پیش فرمائیں اور جدہ سے ہماری واپسی سے پہلے پہلے مزید کتابیں اور بھی بھیج دیں۔

شام کو اپنی کمزوری اور بیماری کے باوجود وہ بازدید کے لیے چوہدری علی اکبر خاں صاحب کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ اندازہ ہوا کہ عربوں کے ہاں "ردِّ زیارت" کی کس قدر اہمیت ہے۔ شیخ نصیف حجاز کی گذشتہ پچاس ساٹھ سال کی چلتی جاگتی تاریخ ہیں۔ حجاز میں ترکی عہد کے حالات و واقعات بڑی دلچسپی اور مزے سے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جدہ اور مکہ معظمہ کے علماء اور ادباء ان سے یہ حالات و واقعات سننے کے لیے اکثر ان کے ہاں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ کسی کو حجاز کی گذشتہ تاریخ کے متعلق کوئی کتاب یا مضمون لکھنا ہوتا ہے تو وہ ان کے ہاں آکر واقعات اور ان کی ترتیب کا اطمینان کرتا ہے۔ جدہ اور مکہ معظمہ کے پرچوں میں کتنے ہی ایسے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن کے لکھنے والوں نے مواد زیادہ تر ان ہی کی مجلسوں سے لیا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس وہ ایک گھنٹہ بیٹھے رہے اور سلطان عبدالحمید کے عہد کے حالات و واقعات سناتے رہے۔ اور واقعات تو مجھے یاد نہیں رہے۔ صرف ایک واقعہ اپنی انتہائی دلچسپی کی وجہ سے ذہن میں رہ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کے لیے باقاعدہ بازار لگا کرتے تھے اور لوگ وہیں سے اپنی "ضرورت کا سامان" خریدا کرتے تھے۔ میں جوان ہو چکا تھا، لیکن ابھی میری شادی نہ ہوئی تھی۔ بعض دوستوں کے مشورے پر میرے والد مرحوم نے ایک دن مجھ سے کہا کہ دیکھو تم جوان ہو چکے ہو، لیکن ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم تمہاری شادی کر سکیں، اس لیے بہتر ہے کہ تم مکہ معظمہ چلے جاؤ اور اپنے لیے کوئی لونڈی لے آؤ۔ پہلے تو یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ لیکن بالآخر والد کے دوستوں کے اصرار پر میں رضامند ہو گیا۔ اگلے دن مکہ معظمہ آیا اور غلاموں اور لونڈیوں کے بازار پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ مختلف دکانوں پر لونڈیاں باقاعدہ کھڑی ہوتی ہیں اور ان کی بولی دی جا رہی ہے۔ اور جو لوگ بولی دے رہے ہیں، وہ آگے بڑھ کر ان کے جسم کے ہر حصّہ

کا۔ سوائے ایک حصہ کے ـــ ہاتھ لگا کر جائزہ لے رہے ہیں۔ اس منظر سے میری طبیعت اس قدر مکدر ہوئی کہ میں الٹے پاؤں بازار سے باہر نکل آیا۔ میں نے سوچا کہ جو عورت کسی مرد کو ہاتھ لگانے سے نہیں روک سکتی وہ آخر میرے کس کام کی ہو سکتی ہے؟

شیخ مصطفیٰ عالم | اگلے روز ۲۰ نومبر ہمارا پروگرام مکہ معظمہ روانہ ہو جانے کا تھا۔ لیکن صبح ہی نماز کے بعد شیخ مصطفیٰ عالم تشریف لے آئے۔ موصوف دراصل مصر کے رہنے والے ہیں۔ ان کا تعلق اخوان سے تھا۔ اس لیے جیل میں بھی رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ان کی رہائی ہوئی اور یہ رہائی کے بعد حج کے لیے مکہ معظمہ آئے، لیکن پھر مصر واپس نہیں گئے۔ اس وقت سے ان کا قیام جدہ میں ہے اور یہاں ایک دینی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایک گھنٹہ تک بیٹھے اور مصر میں اخوان کے حالات بتاتے رہے۔

عمرے کے لیے روانگی | ۔ ۱ بجے کے قریب وہ مبارک ساعت آئی کہ ہم نے غسل کیا، احرام کے کپڑے پہنے، دوگانہ مسنون نماز ادا کی اور پھر زبان پر لبیک اللھم لبیک ... کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جدہ میقات کے اندر واقع ہے اس لیے احرام کا اپنی قیام گاہ ہی سے باندھنا ضروری تھا۔ ہم نے اپنا زیادہ تر سامان تو چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ہاں چھوڑا۔ اپنے ساتھ صرف بستر اور کچھ ضروری سامان لیا اور مکہ معظمہ جانے والی ٹیکسیوں کے اڈے پر پہنچے۔ وہیں استاذ عبدالحکیم عابدین بھی مل گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ مکہ معظمہ جا رہے تھے۔ ہم نے سات سیٹوں کی ٹیکسی ۲۴ ریال کرایہ پر لی۔ ٹیکسی کا یہ کرایہ حج کے علاوہ دوسرے دنوں کے لیے تھا، ورنہ حج کے زمانے میں حاجیوں سے جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے وہ اس سے کم از کم دس بارہ گنا زیادہ ہوتا ہے۔

جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ۴۵ میل کا فاصلہ ہے اور سڑک نہایت شاندار ہے نئی سکیم کے تحت اس وقت اس سڑک کو دوہرا کیا جا رہا تھا۔ ایک راستہ مکہ معظمہ جانے والوں کے لیے اور دوسرا مکہ معظمہ کی طرف سے آنے والوں کے لیے۔ دوسری نئی سڑک آدھی تیار ہو چکی

تھی اور خیال تھا کہ حج ۱۳۷۹ھ تک بقیہ سڑک بھی تیار ہو جائے گی، اس لیے ممکن ہے اب یہ مکمل ہو چکی ہو۔

راستے کے تاریخی آثار تقریباً پندرہ منٹ تو ہمیں جدہ ہی کی آبادی سے نکلنے میں لگ گئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شہر کس قدر پھیل چکا ہے۔ اب بھی مکہ معظمہ کی طرف مزید آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہوا۔ یہ وہی سلسلہ ہے جو بحرِ قلزم کے ساحل کے ساتھ ساتھ یمن سے اردن تک چلا گیا ہے۔ پھر ریگستانی علاقہ شروع ہوا۔ سب سے پہلی بستی جو ہمیں ملی وہ ام السَّلَم تھی۔ اس کے بعد بحرہ آیا۔ پھر جدہ سے گزر ہوا۔ ۳۲ میل چلنے کے بعد سڑک کی بائیں طرف ایک بستی آئی، جس کا موجودہ نام شُمَیْسِی ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا نام حدیبیہ تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں صلح حدیبیہ واقع ہوئی تھی جس جگہ پر صحابۂ کرام کا لشکر ٹھہرا تھا، وہ بالکل سڑک کے کنارے پر ہے اور اب وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس مسجد پر رکنے کا ارادہ کیا، لیکن بعد میں یہ طے کیا کہ پہلے عمرہ سے فارغ ہو لیں۔ اس کے بعد کسی دن خاص طور پر اس مسجد کو دیکھنے کے لیے مکہ معظمہ سے آئیں گے کچھ آگے بڑھے تو سڑک کے دونوں کناروں پر بورڈ لگا ہوا تھا کہ غیر مسلم یہاں سے آگے نہ بڑھیں، کیونکہ حرم کے حدود شروع ہونے والے تھے۔ آدھ میل اور بڑھے تو حرم کے حدود بھی آ گئے اور وہاں سڑک کے دونوں طرف اعلام الحرم (حرم کے نشانات) بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب مکہ معظمہ کی آبادی شروع ہوئی تو سامنے ایک پہاڑ صاف دکھائی دے رہا تھا، جس کے متعلق ڈرائیور اور استاذ عبدالحکیم عابدین نے ہمیں بتایا کہ یہی جبلِ نور ہے جس میں غارِ حرا واقع ہے۔ گزشتہ سفروں میں دونوں مرتبہ رات ہی کے وقت یہاں سے گزر ہوا تھا اس لیے اندازہ نہ ہو سکا کہ جبلِ نور یہاں سے بھی نظر آتا ہے۔

مکہ معظمہ میں حاضری آگے بڑھے تو عبداللہ بن کُلَیب سڑک پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ہم سے ایک دن پہلے ریاض سے روانہ ہو گئے تھے اور پھر ایک دن جدہ میں ٹھہر کر

مکہ معظمہ آگئے تھے۔ مسجد الحرام کے قریب ہی جس طرف سعودی ہسپتال اور لوہ بردوں کی رباط ہے، ہمارے پاکستانی سفارت خانہ نے ایک چہار منزلہ عمارت کی تیسری منزل کرایہ پر لے رکھی ہے جو حج کے دنوں میں سفارت خانہ کے عملہ کے لیے دفتر کا کام بھی دیتی ہے اور اسی میں سرکاری وغیر سرکاری مہمان بھی، جنہیں سفیر صاحب اجازت دیں، قیام کرتے ہیں۔ حج کے سوا دوسرے دنوں میں یہ عموماً خالی رہتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال اور گاہے بگاہے آنے والے مہمانوں کی خدمت کے لیے ایک ملازم بھی مقرر ہے۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے تو حرم میں ظہر کی اذان ہو چکی تھی اور عین جماعت کا وقت تھا ہم نے سامان نیچے ہی ایک دکاندار کی حفاظت میں چھوڑا اور خود جماعت میں شریک ہونے کے لیے حرم کا رخ کیا۔ حرم میں داخل ہوئے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ ہم نے کعبہ ۔۔ زادھا اللہ شرفاً ۔۔ پر محبت و احترام بھری نگاہ ڈالی اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ نماز کے بعد استاذ عبدالحکیم عابدین طواف کے لیے چلے گئے اور ہم اپنی جائے قیام کی طرف واپس آگئے۔ سامان اوپر چڑھا کر مرتب کیا۔ اس کے بعد سفارت خانہ کی طرف سے فلیٹ کی دیکھ بھال پر متعین ملازم بھی آگیا جو مشرقی پاکستان کا رہنے والا عبدالمصور نامی ہے۔ اس نے ہمیں چائے بنا کر پلائی جس پر ہم اس کے بہت ہی شکر گزار ہوئے۔

خطیب حرم سے ملاقات چائے کے بعد عمرہ کے لیے ہم نکل ہی رہے تھے کہ حرم کے خطیب شیخ ابوالسمح عبدالمہیمن آگئے۔ ان کا مکان ہمارے بالکل سامنے اسی گلی میں تھا۔ انہوں نے جب مولانا کی آمد کی خبر سنی تو فوراً تشریف لائے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد گذشتہ مرتبہ (۱۹۵۶ء) حج کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکنے پر افسوس کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں کسی دن اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی جسے ہم نے بخوشی قبول کر لیا۔

عمرہ اس کے بعد ہم عمرہ کے لیے نکلے۔ عمرہ کے لیے باب السلام سے داخل ہونا مسنون ہے۔ باب السلام میں داخل ہونے کے لیے ہمیں کافی لمبا چکر لگانا پڑا، کیونکہ ہمارا قیام باب ابراہیم کی طرف تھا اور باب السلام اس کی مخالف سمت میں واقع ہے۔ جس وقت ہم عمرہ (طواف،

مقام ابراہیم پر دو رکعتیں اور صفا و مروہ کے درمیان سعی) سے فارغ ہوئے، تو عصر کی اذان ہو گئی۔ ہم نے عصر کی نماز حرم ہی میں ادا کی اور پھر اپنی جائے قیام پر واپس آ گئے۔ ہم نے خود ہی ایک دوسرے کے سر کے بال قینچی سے تراش کر احرام کھول دیا۔ جسم میں اگرچہ سخت تکان تھی لیکن دل خوشی سے لبریز تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے گھر کی زیارت اور عمرہ کی سعادت پھر نصیب فرمائی۔ الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات

حرم کی تعمیر اس عرصہ میں ہمیں حرم کی توسیع اور نئی تعمیر کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ توسیع تعمیر کا یہ کام بڑے زوروں پر جاری ہے۔ اس وقت تک صرف ڈیڑھ طرف سے عمارت مکمل ہوئی ہے۔ ساری عمارت دو منزلہ بنائی جا رہی ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان مسعیٰ کو بھی دو رویہ اور دوہرا بنایا جا رہا ہے بلکہ اسے تو مکمل کر دیا گیا ہے۔ جس وسیع پیمانے پر یہ تعمیر ہو رہی ہے، اسے دیکھ کر لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل میں کم از کم پندرہ سال اور لگیں گے۔ لیکن مکمل ہو جانے کے بعد حرم کی وسعت موجودہ وسعت سے دُعائی گنا ہو جائے گی اور اس میں بیک وقت پانچ لاکھ آدمی نماز پڑھ سکیں گے۔ اس کا شمار یقیناً دنیا کی چند بڑی عمارتوں میں سے ہو گا۔ اندازہ یہ ہے کہ پوری تعمیر پر دو ارب روپے کے قریب سرمایہ صرف ہو جائے گا۔ یہ ساری تعمیر شاہ سعود اپنے ذاتی مصارف پر کرا رہے ہیں۔ شاہ سعود کے کارناموں میں اس کا شمار یقیناً سر فہرست ہے۔

(باقی)

سُنّت کے متعلق چند مزید سوالات

[پچھلی دو اشاعتوں میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مدیر ترجمان القرآن کی جو مراسلت ناظرین کے سامنے آچکی ہے، اس کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک تازہ خط وصول ہوا ہے جسے مدیر ترجمان القرآن کے جواب سمیت ذیل میں درج کیا جارہا ہے]

ڈاکٹر صاحب کا خط

محترم مولانا السلام علیکم۔

میرے خط مورخہ ۱۷ اگست کا جواب آپ کی طرف سے ترجمان القرآن ماہ اکتوبر و نومبر کی اشاعتوں میں آچکا ہے۔ اکتوبر کے ترجمان میں شائع شدہ جواب کا بقیہ حصہ بھی بذریعہ ڈاک موصول ہوگیا تھا۔ اس جواب کے آخر میں آپ نے فرمایا ہے کہ آگے کسی بحث کا سلسلہ چلنے سے پہلے آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا میں حق کے آگے جھکنے کے لیے تیار بھی ہوں یا نہیں۔

محترم! ایک سچے مسلمان کی طرح میں ہر وقت حق کے آگے جھکنے پر تیار ہوں۔ لیکن جہاں حق موجود ہی نہ ہو بلکہ کسی بُت کے آگے جھکنا مقصود ہو تو کم از کم میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شخصیت پرستی میرا مسلک نہیں۔ میں بار بار آپ کو تکلیف اس لیے دیتا ہوں کہ مسئلہ زیر بحث صاف ہوجائے اور ایک ہی ملک میں بسنے والے اور ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے والے الگ الگ راستے اختیار نہ کریں۔ اور آپ ہیں کہ لفّاظی اور جذبات کا مرکب پیش کرنے میں سارا زورِ قلم اس لیے صرف کررہے ہیں کہ میں جھک جاؤں۔ آپ نے اتنا طویل جواب لکھنے میں یقیناً بڑی زحمت اٹھائی

لیکن میری بدنصیبی ملاحظہ فرمائیے کہ اس سے اور اُلجھنیں پیدا ہوگئیں۔

آپ نے یہ درست فرمایا کہ میرے لیے قرآن کا مطالعہ میرے بہت سے مشاغل میں سے ایک ہے اور آپ نے اپنی عمر اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے کرنے اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں صرف کی ہے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ آپ کی یہ عمر بھر کی محنت اپنی ذات کے لیے ہو تو ہو لیکن عام مسلمانوں کے لیے کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکی۔ آپ کے خط میں بہت سے ابہامات ہیں۔ کئی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ کئی باتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قرآن کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے بڑا تفصیلی جواب درکار ہے جسے میں انشاء اللہ العزیز اوپیں فراغت میں مکمل کر سکوں گا۔ لیکن اس سلسلے میں دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ اس وقت میں صرف انہیں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ساری بحث سمٹ سمٹا کر یہاں آجاتی ہے کہ رسول اللہ ؐ پر جو وحی خدا کی طرف سے نازل ہوتی وہ سب کچھ قرآن کے اندر ہے یا باہر کہیں اور بھی۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ وحی کا ایک حصہ قرآن کے علاوہ اور بھی ہے۔ اس ضمن میں حسب ذیل امور وضاحت طلب ہیں:-

(۱) جہاں تک ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا تعلق ہے کیا وحی کے دونوں حصے یکساں حیثیت رکھتے ہیں؟

(۲) قرآن نے جہاں "ما انزل الیک" کہا ہے کیا اس سے مراد صرف قرآن ہے یا وحی کا مذکورہ صدر حصہ بھی؟

(۳) وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟ کیا قرآن کی طرح اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے لی ہوئی ہے؟

(۴) قرآن کے ایک لفظ کی جگہ عربی کا دوسرا لفظ جو اس کے مرادف المعنی ہو

رکھ دیا جائے تو کیا اس لفظ کو "وحی منزل من اللہ" سمجھ لیا جائے گا؟ کیا وحی کے مذکورہ بالا دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟

(۵) بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا۔ کیا آپ ان کے ہمنوا ہیں؟ اگر نہیں تو اس باب میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟

(۶) اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کے بعض ارشادات وحی الٰہی تھے اور بعض وحی نہیں تھے تو کیا آپ فرمائیں گے کہ حضورؐ کے جو ارشادات وحی تھے ان کا مجموعہ کہاں ہے؟ نیز آپ کے جو ارشادات وحی نہیں تھے مسلمانوں کے لیے ایمان و اطاعت کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟

(۷) اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کہدے کہ وہ "منزل من اللہ" نہیں ہے تو آپ اس سے متفق ہونگے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟

(۸) رسول اللہ (صلعم) نے دین کے احکام کی بجا آوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس قسم کا رد و بدل قرآن کے احکام کی جزئیات میں بھی کیا جاسکتا ہے؟

والسلام

مخلص: عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

عنایت نامہ مورخہ ۵ نومبر ملا۔ کچھ خرابیٔ صحت اور کچھ مصروفیت کے باعث جواب

ذرا تاخیر سے دے رہا ہوں اور اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔
آپ نے حسبِ سابق پھر وہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک بحث کو صاف کرنے سے پہلو بچا کر آگے کچھ نئے سوالات چھیڑ دیئے۔ حالانکہ آپ کو نئے مسائل سامنے لانے سے پہلے یہ بتانا چاہیے تھا کہ پچھلے خط میں آپ کے دس نکات پر جو بحث میں نے کی تھی اس میں سے کیا چیز آپ مانتے ہیں اور کیا نہیں مانتے، اور جس چیز کو نہیں مانتے اسے رد کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ اسی طرح آپ کو میرے اُن واضح اور متعین سوالات کا بھی کوئی جواب دینا چاہیے تھا جو میں نے اُس خط میں آپ سے کیے تھے۔ لیکن ان سوالات کا سامنا کرنے سے گریز کر کے اب آپ کچھ اور سوالات لے آئے ہیں اور مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں ان کا جواب دوں۔ یہ آخر کیا طرزِ بحث ہے؟
میرے پچھلے خط پر آپ کا تبصرہ کچھ عجیب ہی سا ہے۔ تمام اہم نکات جو اس میں زیرِ بحث آئے تھے، اور بنیادی سوالات جن پر اس میں روشنی ڈالی گئی تھی، ان سب کو چھوڑ کر سب سے پہلے آپ کی نظر میرے آخری فقرے پر پڑتی ہے اور اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "میں حق کے آگے تو جھکنے پر تیار رہوں لیکن بت کے آگے میں نہیں جھک سکتا۔ اور شخصیت پرستی میرا مسلک نہیں ہے۔" سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسا "بت" ہے جس کے آگے جھکنے کے لیے آپ سے کہا گیا تھا؟ اور کس "شخصیت پرستی" کی آپ کو دعوت دی گئی تھی؟ میں نے تو صریح آیاتِ قرآنی سے یہ ثابت کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حاکم، شارع، قاضی اور معلّم و رہنما ہیں اور اللہ ہی کے حکم کی بنا پر آپ کی اطاعت اور آپ کا اتباع ایک مومن پر واجب ہے۔ اسی حق کے مقابلہ میں جھکنے کے لیے میں نے آپ سے عرض کیا تھا۔ اس پر آپ کا مذکورۂ بالا ارشاد یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی ہی وہ "بت" ہے جس کے آگے جھکنے سے آپ کو انکار ہے، اور یہی وہ "شخصیت پرستی" ہے جس سے آپ گریزاں ہیں۔ اگر میرا یہ شبہ صحیح ہے تو میں عرض کروں گا

کہ دراصل آپ شخصیت پرستی سے نہیں خدا پرستی سے انکار کر رہے ہیں، اور ایک بہت بڑا بُت آپ کے اپنے نفس میں چھپا ہوا ہے جس کے آگے آپ سجدہ ریز ہیں۔ جہاں سرِ اطاعت خم کرنے کا خدا نے حکم دیا ہو وہاں جھک جانا بُت کے آگے جھکنا نہیں، خدا کے آگے جھکنا ہے اور یہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہے۔ البتہ اس سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ دراصل حکمِ خدا کے آگے جھکنے کے بجائے اپنے بتِ نفس کے آگے جھکتا ہے۔

پھر آپ میرے سارے دلائل کو اس طرح چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ تم نے "لفاظی اور جذبات کا مرکب پیش کرنے میں سارا زورِ قلم صرف کیا ہے"۔ یہ رائے آپ چاہیں تو بخوشی رکھ سکتے ہیں، لیکن اس کا فیصلہ اب وہ ہزاروں ناظرین کریں گے جن کی نظر سے یہ مراسلت گزر رہی ہے کہ میں نے دلائل پیش کیے ہیں یا محض لفاظی کی ہے اور آپ ہٹ دھرمی کا اظہار فرما رہے ہیں یا حق پرستی کا۔

پھر آپ اپنی اس بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ میرے جوابات سے آپ کی الجھنیں اور بڑھ گئی ہیں۔ مجھے بھی اس کا افسوس ہے۔ مگر ان الجھنوں کا منبع کہیں باہر نہیں، آپ کے اندر ہی موجود ہے۔ آپ نے یہ مراسلت واقعی "بات سمجھنے" کے لیے کی ہوتی تو سیدھی بات سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ لیکن آپ کی تو اسکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی اس امید پر بھیجے تھے[1] کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے اور پھر ان کا ایک مجموعہ شائع کر کے یہ پروپیگنڈا کیا جا سکے گا کہ علماءِ سنت سنت سنت تو کرتے ہیں مگر دو عالم بھی سنّت کے بارے میں ایک متفقہ رائے نہیں رکھتے۔ وہی ٹکنیک جس کا ایک شاہکار ہمیں منیر رپورٹ میں ملتا ہے۔ اب میرے جوابات سے آپ کی یہ اسکیم آپ ہی کے اوپر اُلٹ پڑی ہے اس لیے آپ کو سمجھانے

[1] یہ بات مجھے بعد میں مولانا داؤد غزنوی اور مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل اور بعض دوسرے حضرات سے معلوم ہوئی کہ بعینہٖ یہی سوالات آپ کی طرف سے ان کو بھی بھیجے گئے تھے۔

کی جتنی کوشش بھی میں کرتا جاتا ہوں آپ کی الجھن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس نوعیت کی الجھن کا آخر میں کیا علاج کر سکتا ہوں۔ اس کا علاج تو آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ حق بات سمجھنے اور ماننے کی مخلصانہ خواہش اپنے اندر پیدا کیجیے اور ایک مسلک خاص کے حق میں پروپگنڈا کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کی فکر چھوڑ دیجیے۔ اس کے بعد انشاء اللہ ہر معقول بات بآسانی آپ کی سمجھ میں آنے لگے گی۔

پھر آپ میری طرف یہ غلط دعویٰ منسوب کرتے ہیں کہ "میں نے اپنی عمر قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں صرف کی ہے" حالانکہ میں نے اپنے متعلق یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ میں نے تو اپنے پچھلے خط میں جو کچھ کہا تھا وہ یہ تھا کہ اسلامی تاریخ میں بے شمار ایسے لوگ گزرے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کر دی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا کہ میں اپنے حق میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں۔

اتنی غیر متعلق باتیں کر چکنے کے بعد آپ میرے خط کے اصل مبحث کے متعلق صرف اتنی مختصر سی بات ارشاد فرمانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "آپ کے خط میں بہت سے ابہامات ہیں۔ کئی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ کئی باتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قرآن کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے" سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ مبہم بات بھی کوئی ہو سکتی ہے؟ آخر آپ نے کچھ تو بتایا ہوتا کہ میرے اس خط میں کیا ابہامات تھے، کیا چیزیں قرآن کے خلاف تھیں اور قرآن کی کن آیات کا مطلب میں ٹھیک نہیں سمجھا۔ ان ساری باتوں کو تو آئندہ کسی فرصت کے لیے آپ نے اٹھا کر رکھ دیا اور اپنا آج کا وقت کچھ نئے سوالات تصنیف کرنے میں صرف فرما دیا حالانکہ یہ وقت پچھلے سوالات پر گفتگو کرنے میں استعمال ہونا چاہیے تھا۔

اگر اس مراسلت سے میرے پیش نظر صرف آپ کو "بات سمجھانا" ہوتا تو آپ کی

طرف سے "بات سمجھنے" کی کوشش کا یہ نمونہ دیکھ کر میں آئندہ کے لیے معذرت ہی کر دیتا۔ لیکن در اصل میں آپ کے ذریعہ سے دوسرے بہت سے مریضوں کے علاج کی فکر کر رہا ہوں جن کے ذہن اسی طرح کے سوالات چھیڑ چھیڑ کر پراگندہ کیے جا رہے ہیں، اس لیے میں انشاءاللہ آپ کے ان تازہ سوالات کا جواب بھی دوں گا، اور ایسے ہی سوالات آپ اور چھیڑیں گے تو ان کا جواب بھی دوں گا، تاکہ جن لوگوں کے اندر اس گمراہی کے لیے ابھی تک عناد پیدا نہیں ہوئی ہے وہ سنت کے مسئلے کا ہر پہلو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کو گمراہ کرنا آسان نہ رہے۔

وحی پر ایمان کی وجہ آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ:

"جہاں تک ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا تعلق ہے کیا وحی کے دونوں حصے یکساں حیثیت رکھتے ہیں؟"

اس سوال کا صحیح جواب آدمی کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آ سکتا جب تک کہ وہ پہلے یہ نہ سمجھ لے کہ وحی پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے کی اصل بنیاد کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وحی خواہ وہ کسی نوعیت کی بھی ہو، براہِ راست ہمارے پاس نہیں آئی ہے کہ ہم بجائے خود اس کے منزل من اللہ ہونے کو جانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ وہ تو ہمیں رسول کے ذریعہ سے ملی ہے اور رسول ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ ہدایت میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم وحی پر (یعنی اس کے من جانب اللہ ہونے پر) ایمان لائیں، ہم رسول پر ایمان لاتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کا سچا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہی یہ نوبت آ سکتی ہے کہ ہم رسول کے بیان پر اعتماد کر کے اس وحی کو خدا کی بھیجی ہوئی وحی مانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ پس اصل چیز وحی پر ایمان نہیں بلکہ رسول پر ایمان اور اس کی تصدیق ہے۔ اور اسی کی تصدیق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے وحی کو وحیِ خداوندی مانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ رسول کی رسالت پر ہمارے ایمان کی وجہ قرآن نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس قرآن پر ہمارے ایمان کی وجہ رسول کی رسالت پر ایمان ہے۔ واقعات کی ترتیب یہ نہیں ہے

کہ پہلے قرآن ہمارے پاس آیا ہو اور اس نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمارا تعارف کرایا ہو، اور اس کے بیان کو صحیح جان کر ہم نے حضور کو خدا کا رسول تسلیم کیا ہو۔ بلکہ صحیح ترتیب واقعات یہ ہے کہ پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر رسالت کا دعویٰ پیش کیا، پھر جس نے بھی ان کو رسول برحق مانا اس نے آن کی اس بات کو بھی برحق مان لیا کہ یہ قرآن جو وہ پیش فرما رہے ہیں یہ کلام محمدؐ نہیں بلکہ کلام اللہ ہے۔

یہ ایک ایسی بدیہی پوزیشن ہے جس سے کوئی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ اس پوزیشن کو اگر آپ مانتے ہیں تو اپنی جگہ خود غور کیجیے کہ جس رسول کے اعتماد پر ہم نے قرآن کو وحی مانا ہے وہی رسول اگر ہم سے یہ کہے کہ مجھے قرآن کے علاوہ بھی خدا کی طرف سے ہدایات اور احکام بذریعہ وحی ملتے ہیں، تو اس کی تصدیق نہ کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ اور آخر رسول کے ذریعہ سے آنے والی ایک وحی اور دوسری وحی میں فرق کیوں ہو؟ جب ایمان بالرسالت ہی وحی پر ایمان کی اصل بنیاد ہے تو اطاعت کرنے والے کے لیے اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے کہ رسول نے خدا کا ایک حکم قرآن کی کسی آیت کی شکل میں ہمیں پہنچایا ہے یا اپنے کسی فرمان یا عمل کی شکل میں؟ مثال کے طور پر پانچ وقت کی نماز بہر حال ہم پر فرض ہے اور امت اس کو فرض مانتی ہے، باوجودیکہ قرآن کی کسی آیت میں یہ حکم نہیں آیا کہ "اے مسلمانو! تم پر پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی ہے"۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن میں بھی یہ حکم آجاتا تو اس کی فرضیت اور اس کی تاکید میں کیا اضافہ ہو جاتا؟ اس وقت بھی یہ ویسی ہی فرض ہوتی جیسی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے فرض ہے۔

ما انزل اللہ سے کیا چیز مراد ہے؟ آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ:

"قرآن نے جہاں مَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ کہا ہے کیا اس سے مراد صرف قرآن ہے یا وحی کا مذکورہ صدر حصہ بھی؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں "نازل کرنے" کے ساتھ "کتاب" یا "ذکر" یا "فرقان"

وغیرہ کی تصریح کی گئی ہے صرف اسی جگہ مَآ اَنْزَلَ اللہُ سے مراد قرآن ہے۔ رہے وہ مقامات جہاں کوئی قرینہ ان الفاظ کو قرآن کے لیے مخصوص نہ کر رہا ہو، وہاں یہ الفاظ اُن تمام ہدایات و تعلیمات پر حاوی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو ملی ہیں، خواہ وہ آیاتِ قرآنی کی صورت میں ہوں، یا کسی اور صورت میں۔ اس کی دلیل خود قرآن مجید ہی میں موجود ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن ہی نازل نہیں ہوا ہے بلکہ کچھ اور چیزیں بھی نازل ہوئی ہیں۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (آیت ۱۱۳)	اور اللہ نے تیرے اوپر نازل کی کتاب اور حکمت اور تجھے سکھایا وہ کچھ جو تو نہ جانتا تھا۔

یہی مضمون سورۂ بقرہ میں بھی ہے:

وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَۃِ یَعِظُکُمْ بِہٖ (آیت ۲۳۱)	اور یاد رکھو اپنے اوپر اللہ کے احسان کو، اور اُس کتاب اور حکمت کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا پاس رکھنے کی نصیحت فرماتا ہے۔

اسی بات کو سورۂ احزاب میں دہرایا گیا ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کو نصیحت فرمائی گئی ہے کہ:

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ ۔ (آیت ۳۴)	اور یاد رکھو کہ تمہارے گھروں میں (لوگوں کو) اللہ کی آیات اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب کے علاوہ ایک چیز "حکمت" بھی نازل کی گئی تھی جس کی تعلیم آپ لوگوں کو دیتے تھے۔ اس کا مطلب آخر اس کے سوا کیا ہے کہ جس دانائی کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام کرتے اور قیادت و رہنمائی کے فرائض انجام دیتے تھے، وہ محض آپ کی آزادانہ ذاتی قوتِ فیصلہ

(PRIVATE JUDGEMENT) نہ تھی بلکہ یہ چیز بھی اللہ نے آپ پر نازل کی تھی۔ نیز یہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے آپ خود ہی استعمال نہ کرتے تھے بلکہ لوگوں کو سکھاتے بھی تھے (یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ)۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سکھانے کا عمل یا تو قول کی صورت میں ہو سکتا تھا یا فعل کی صورت میں۔ اس لیے امت کو آنحضرتؐ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ دو چیزیں ملی تھیں۔ ایک کتاب۔ دوسری حکمت، حضورؐ کے اقوال کی صورت میں بھی اور افعال کی صورت میں بھی۔

پھر قرآن مجید ایک اور چیز کا ذکر بھی کرتا ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ نازل کی ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ (الشوریٰ - ۱۷)	اللہ ہی ہے جس نے نازل کی کتاب حق کے ساتھ اور میزان۔
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید - ۲۵)	ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

یہ "میزان" جو کتاب کے ساتھ نازل کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ وہ ترازو تو نہیں ہے جو ہر بنیے کی دوکان پر رکھی ہوئی مل جاتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق انسانی زندگی میں توازن قائم کرتی ہے، اس کے بگاڑ کو درست کرتی ہے، اور افراط و تفریط کو دور کر کے انسانی اخلاق و معاملات کو عدل پر لاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ اس چیز کو انبیاء پر "نازل" کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اپنے پاس سے وہ رہنمائی کی صلاحیت عطا فرمائی جس سے انہوں نے کتاب اللہ کے منشا کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظام عدل قائم کیا۔ یہ کام ان کی ذاتی قوت اجتہاد اور رائے پر منحصر نہ تھا۔ بلکہ اللہ کی نازل کردہ میزان سے تول تول کر وہ فیصلہ کرتے تھے کہ حیات انسانی کے مرکب میں کس جز کا کیا وزن ہونا چاہیے۔

پھر قرآن ایک تیسری چیز کی بھی خبر دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ نازل کی گئی تھی:-

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (التغابن - ۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الاعراف - ۱۵۷)

پس جو لوگ ایمان لائیں اس رسول پر اور اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (المائدہ - ۱۵-۱۶)

تمہارے پاس آگیا ہے نور اور کتاب مبین جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔

ان آیات میں جس "نور" کا ذکر کیا گیا ہے وہ کتاب سے الگ ایک چیز تھا، جیسا کہ تیسری آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں۔ اور یہ نور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول پر نازل کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہی ہو سکتی ہے جو اللہ نے حضور کو عطا فرمائی تھی، جس سے آپ نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح فرمایا، جس کی مدد سے عملی زندگی کے مسائل حل کیے، اور جس کی روشنی میں کام کر کے آپ نے اخلاق و روحانیت، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ یہ کسی پرائیویٹ آدمی کا کام نہ تھا جس نے بس خدا کی کتاب پڑھ پڑھ کر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جدوجہد کر ڈالی ہو۔ بلکہ یہ خدا کے اس نمائندے کا کام تھا جس نے کتاب کے ساتھ براہ راست خدا ہی سے علم اور بصیرت کی روشنی بھی پائی تھی۔

ان تصریحات کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جب ہمیں دوسری سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف ما انزل اللہ کی پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس سے مراد محض قرآن ہی کی پیروی نہیں ہوتی، بلکہ اس حکمت اور اس نور اور اس میزان کی پیروی بھی ہوتی ہے جو قرآن کے ساتھ ہی

صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی تھی اور جس کا ظہور لامحالہ حضورؐ کی سیرت و کردار اور حضورؐ کے اقوال و افعال ہی میں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن کہیں یہ کہتا ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کی پیروی کرو (مثلاً آیت ۷ : ۳ میں)، اور کہیں یہ ہدایت کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو (مثلاً آیات ۳ : ۳۱-۳۲ : ۲۱ اور ۷ : ۱۵۶ میں)۔ اگر یہ دو مختلف چیزیں ہوتیں تو ظاہر ہے کہ قرآن کی ہدایات متضاد ہو جاتیں۔

سنت کہاں ہے؟ آپ کا تیسرا سوال یہ ہے:

"وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟ کیا قرآن کی طرح اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے لی ہوئی ہے؟"

اس سوال کے دو حصے الگ الگ ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ "وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟" بعینہٖ یہ سوال آپ پہلے مجھ سے کر چکے ہیں اور میں اس کا مفصل جواب دے چکا ہوں۔ مگر آپ اسے پھر اس طرح دہرا رہے ہیں کہ گویا آپ کو میرے سے کوئی جواب ملا ہی نہیں۔ براہ کرم اپنا آوّلین خط اٹھا کر دیکھیے جس میں سوال نمبر ۲ کا مضمون وہی تھا جو آپ کے اس تازہ سوال کا ہے۔ اس کے بعد میرا دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے جس میں میں نے آپ کو اس سوال کا تفصیلی جواب دیا ہے۔[۵۶] اب آپ کا اسی سوال کو پھر پیش کرنا اور میرے پہلے جواب کو بالکل نظر انداز کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو آپ اپنے ہی خیالات میں گم رہتے ہیں اور دوسرے کی کوئی بات آپ کے ذہن تک پہنچنے کا راستہ ہی نہیں پاتی، یا پھر آپ یہ بحث محض برائے بحث فرما رہے ہیں۔

کیا سنت کی حفاظت بھی خدا نے کی ہے؟ رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ تو اس کا جواب سننے سے پہلے ذرا اس بات پر غور کر لیجیے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری جو اللہ میاں نے لی تھی اس کو انہوں نے براہِ راست عملی جامہ پہنایا، یا انسانوں کے ذریعہ سے اس کو عملی جامہ پہنوایا؟ ظاہر ہے آپ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں دے سکتے کہ اس حفاظت کے لیے انسان ہی ذریعہ بنائے گئے۔ اور عملاً یہ حفاظت اس طرح ہوئی کہ حضورؐ سے جو قرآن لوگوں کو ملا تھا اس کو

[۵۶] ملاحظہ ہو ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۲۷ تا ۲۳۳۔

اسی زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے لفظ بلفظ یاد کر لیا، پھر ہزاروں سے لاکھوں، اور لاکھوں سے کروڑوں اس کو نسلاً بعد نسل لیتے اور یاد کرتے چلے گئے، حتیٰ کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں رہا کہ قرآن کا کوئی لفظ دنیا سے محو ہو جائے، یا اس میں کسی وقت کوئی رد و بدل ہو اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آجائے۔ یہ حفاظت کا غیر معمولی انتظام آج تک دنیا کی کسی دوسری کتاب کے لیے نہیں ہو سکا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کیا ہوا انتظام ہے۔

اچھا، اب ملاحظہ فرمایئے کہ جس رسول کو ہمیشہ کے لیے اور تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا تھا اور جس کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دینے کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا، اس کے کارنامۂ حیات کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا محفوظ فرمایا کہ آج تک تاریخ انسانی میں گزرے ہوئے کسی نبی، کسی پیشوا، کسی لیڈر اور رہنما اور کسی بادشاہ یا فاتح کا کارنامہ اس طرح محفوظ نہیں رہا ہے۔ اور یہ حفاظت بھی انہی ذرائع سے ہوئی ہے جن ذرائع سے قرآن کی حفاظت ہوئی ہے۔ ختم نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے آخری رسولؐ کی رہنمائی اور اس کے نقوش قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری لے لی ہے تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسان کی رہنمائی کرتی رہے اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع جریدۂ عالم پر ان نقوش کو کیسا ثبت کیا ہے کہ آج کوئی طاقت انہیں مٹا نہیں سکتی۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ یہ وضو، یہ پنجوقتہ نماز، یہ اذان، یہ مساجد کی نماز با جماعت، یہ عیدین کی نمازیں، یہ حج کے مناسک، یہ بقر عید کی قربانی، یہ زکوٰۃ کی شرحیں، یہ ختنہ، یہ نکاح و طلاق و وراثت کے قاعدے، یہ حرام و حلال کے ضابطے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دوسرے بہت سے اصول اور طور طریقے جس روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیے اسی روز سے وہ مسلم معاشرے میں ٹھیک اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھ گئیں، اور پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں نسلاً بعد نسل ان کی اسی طرح پیروی کرتے چلے آرہے ہیں جس طرح ان کی ایک نسل

سے دوسری نسل قرآن لیتی چلی آرہی ہے۔ ہماری تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ رسولِ پاک کی جن سنتوں پر قائم ہے ان کے صحیح ہونے کا ثبوت بعینہٖ وہی ہے جو قرآنِ پاک کے محفوظ ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے۔

پھر دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے عہد کی سوسائٹی کا کیسا مفصل نقشہ، کیسی جزئی تفصیلات کے ساتھ، کیسے مستند ریکارڈ کی صورت میں آج ہم کو مل رہا ہے۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک قول و فعل کی سند موجود ہے جس کو جانچ کر ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ روایت کہاں تک قابلِ اعتماد ہے۔ صرف ایک انسان کے حالات معلوم کرنے کی خاطر اس دور کے کم و بیش ۶ لاکھ انسانوں کے حالات مرتب کر دیئے گئے تاکہ ہر وہ شخص جس نے کوئی روایت اُس انسانِ عظیم کا نام لے کر بیان کی ہے اس کی شخصیت کو پرکھ کر رائے قائم کی جا سکے کہ ہم اس کے بیان پر کس حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ تاریخی تنقید کا ایک وسیع علم انتہائی باریک بینی کے ساتھ صرف اس مقصد کے لیے مدوّن ہو گیا کہ اس ایک فردِ فرید کی طرف جو بات بھی منسوب ہو اسے ہر پہلو سے جانچ پڑتال کر کے صحت کا اطمینان کر لیا جائے۔ کیا دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی اور مثال بھی ایسی ملتی ہے کہ کسی ایک شخص کے حالات محفوظ کرنے کے لیے انسانی ہاتھوں سے یہ اہتمام عمل میں آیا ہو؟ اگر نہیں ملتی اور نہیں مل سکتی، تو کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کارفرما ہے جو قرآن کی حفاظت میں کارفرما رہی ہے؟

وحی سے مراد کیا چیز ہے آپ کا چوتھا سوال یہ ہے :-

"قرآن کے ایک لفظ کی جگہ عربی کا دوسرا لفظ جو اس کے مرادف المعنیٰ ہو رکھ دیا جائے تو کیا اس لفظ کو "وحی منزل من اللہ" سمجھ لیا جائے گا؟ کیا وحی کے مذکورہ بالا دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟"

یہ ایسا مہمل سوال آپ نے کیا ہے کہ میں کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ آخر یہ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اس معنی میں ہیں کہ آپ نے تفسیر بیضاوی یا جلالین کی طرح کی کوئی تفسیر لکھی تھی جس میں قرآن کے عربی الفاظ کی تشریح میں کچھ دوسرے مترادف عربی الفاظ درج کر دیئے تھے اور ان تفسیری فقروں کو اب کوئی شخص "وحی منزل من اللہ" کہہ رہا ہے۔ جو بات آپ سے بار بار کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبر کی حیثیت سے جو کچھ بھی کیا اور کہا ہے وہ بربنائے وحی ہے۔ آپ کا پورا پیغمبرانہ کارنامہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں نہ تھا بلکہ خدا کے نمائندۂ مجاز ہونے کی حیثیت میں تھا۔ اس حیثیت میں آپ کوئی کام بھی خدا کی مرضی کے خلاف یا اس کے بغیر نہ کر سکتے تھے۔ ایک معلّم، ایک مربّی، ایک مصلحِ اخلاق، ایک معمارِ تہذیب و تمدن، ایک قاضی، ایک مقنّن، ایک مدبّر، ایک سپہ سالار، ایک حکمران کی حیثیت میں آپ نے جتنا کام بھی کیا وہ سب دراصل خدا کے رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام تھا۔ اس میں خدا کی وحی آپ کی رہنمائی اور نگرانی کرتی تھی، اور کہیں ذرا سی چوک بھی ہو جاتی تو خدا کی وحی بروقت اس کی اصلاح کر دیتی تھی۔ اس وحی کو اگر آپ اس معنی میں لیتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کی تشریح میں کچھ عربی زبان کے مترادف الفاظ نازل ہو جاتے تھے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ "بریں علم و دانش بباید گریست"۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وحی لازماً الفاظ کی صورت ہی میں نہیں ہوتی۔ وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈالا جائے۔ وہ ذہن و فکر کے لیے ایک رہنمائی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک معاملہ کا صحیح فہم بخشنے اور ایک مسئلے کا ٹھیک حل یا ایک موقع کے لیے مناسب تدبیر سُجھانے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ محض ایک روشنی بھی ہو سکتی ہے جس میں آدمی اپنا راستہ صاف دیکھ لے۔ وہ ایک سچا خواب بھی ہو سکتی ہے۔ اور وہ پردے کے پیچھے سے ایک آواز یا فرشتے کے ذریعہ سے آیا ہوا ایک پیغام بھی ہو سکتی ہے۔ عربی زبان میں لفظ وحی کے معنی "اشارۂ لطیف" کے ہیں۔

انگریزی میں اس سے قریب تر لفظ (INSPIRATION) ہے۔ اگر آپ عربی نہیں جانتے تو انگریزی زبان ہی کی کسی لغت میں اس لفظ کی تشریح دیکھ لیں۔ اس کے بعد آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ لفظ کے مقابلہ میں مترادف لفظ رکھنے کا یہ عجیب و غریب تصور، جسے آپ وحی کے معنی میں لے رہے ہیں، کیسا طفلانہ تصور ہے۔

آپ کا پانچواں سوال یہ ہے:

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا کیا آپ ان کے ہمنوا ہیں؟ اگر نہیں تو اس باب میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟"

اس سوال کا جواب سوال نمبر ۴ میں آ گیا ہے۔ اور وہ عقیدہ جو میں نے اوپر بیان کیا ہے وہ "بعض لوگوں" کا نہیں بلکہ آغازِ اسلام سے آج تک تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے

محض تکرارِ سوال آپ کا چھٹا سوال یہ ہے:

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حضور کے بعض ارشادات وحی الٰہی تھے اور بعض وحی نہ تھے تو کیا آپ فرمائیں گے کہ حضور کے جو ارشادات وحی تھے ان کا مجموعہ کہاں ہے، نیز آپ کے جو ارشادات وحی نہیں تھے مسلمانوں کے لیے ایمان و طاعت کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟"

اس سوال کے پہلے حصے میں آپ نے اپنے سوال نمبر ۳ کو پھر دہرا دیا ہے اور اس کا جواب وہی ہے جو اوپر اسی سوال کا دیا جا چکا ہے۔ دوسرے حصے میں آپ نے اُس بات کا اعادہ کیا ہے جو اس سے پہلے اپنے خط نمبر ۲ میں آپ بیان فرما چکے ہیں اور میں اس کا جواب عرض کر چکا ہوں۔ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن، جولائی ۶۰ء صفحہ ۲۴۱) ۔ شبہ ہوتا ہے کہ آپ میرے جوابات کو غور سے پڑھتے بھی نہیں ہیں اور ایک ہی طرح کے سوالات کو دہراتے چلے جاتے ہیں۔

ایمان و کفر کا مدار | آپ کا ساتواں سوال یہ ہے:

"اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کہہ دے کہ وہ منزل من اللہ نہیں ہے تو آپ اس سے متفق ہوں گے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے جن سنتوں کی شہادت ملتی ہے ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے سنت ہونے پر امت شروع سے آج تک متفق رہی ہے یعنی بالفاظ دیگر وہ متواتر سنتیں ہیں اور امت کا ان پر اجماع ہے۔ ان میں سے کسی کو ماننے سے جو شخص بھی انکار کرے گا وہ اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا جس طرح قرآن کی کسی آیت کا انکار کرنے والا خارج از اسلام ہو گا۔ دوسری قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے ثبوت میں اختلاف ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی سنتوں میں سے کسی کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری تحقیق میں فلاں سنت ثابت نہیں ہے اس لیے میں اسے قبول نہیں کرتا تو اس قول سے اس کے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہ آئے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم علمی حیثیت سے اس کی رائے کو صحیح سمجھیں یا غلط۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ یہ واقعی سنتِ رسول ہو بھی تو میں اس کی اطاعت کا پابند نہیں ہوں، تو اس کے خارج از اسلام ہونے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں، کیونکہ وہ رسول کی حیثیتِ حکمرانی (AUTHORITY) کو چیلنج کرتا ہے جس کی کوئی گنجائش دائرۂ اسلام میں نہیں ہے۔

کیا احکامِ سنت میں ردوبدل ہو سکتا ہے؟ | آپ کا آٹھواں سوال یہ ہے:

"رسول اللہ (صلعم) نے دین کے احکام کی بجا آوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس قسم کا ردوبدل قرآن کی جزئیات میں بھی کیا جا سکتا ہے؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی احکام کے جزئیات ہوں یا ثابت شدہ سنتِ رسولؐ کے کسی حکم کے جزئیات، دونوں کے اندر صرف اسی صورت میں اور اسی حد تک ردّوبدل ہو سکتا ہے جب اور جس حد تک حکم کے الفاظ کسی ردّوبدل کی گنجائش دیتے ہوں، یا کوئی دوسری نص ایسی ملتی ہو جو کسی مخصوص حالت کے لیے کسی خاص قسم کے احکام میں ردّوبدل کی اجازت دیتی ہو۔ اس کے ماسوا کوئی مومن اپنے آپ کو کسی حال میں بھی خدا اور رسول کے احکام میں ردّوبدل کر دینے کا مختار و مجاز تصور نہیں کر سکتا۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے جو اسلام سے نکل کر مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا طریق کار یہی ہے کہ پہلے رسول کو آئین و قانون سے بے دخل کر کے "قرآن بلا محمدؐ" کی پیروی کا نرالا مسلک ایجاد کریں، پھر قرآن سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کی ایسی من مانی تاویلات شروع کر دیں جنہیں دیکھ کر شیطان بھی اعترافِ کمال پر مجبور ہو جائے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

(بقیہ مطبوعات)

بہ نسبت سو گنا زیادہ خراب ہوتی ہے جو اپنی سوکنوں کے ساتھ خاوند کی حفاظت اور پاسبانی میں زندگی بسر کرتی ہے۔ جب ہم اُن بدنصیب عورتوں کے ہجوم کو دیکھتے ہیں جو مغربی شہروں کی مختلف گلیوں میں رات کو بے یار و مددگار پھرتی ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو تعددِ ازواج کا طعنہ دیں۔ ایک عورت کے لیے یہ چیز بدرجہا بہتر ہے کہ وہ دوسری خواتین کے ساتھ ایک ہی مرد سے وابستہ رہے۔ احترام سے زندگی بسر کرے، جائز بچے اُس کی گود میں ہوں اور اس طرح وہ دھوکہ بازوں کی ہوس کاریوں کا شکار بننے سے محفوظ رہے۔"

پوری کتاب اسی قسم کے فاضلانہ مباحث پر مشتمل ہے۔ کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پروف احتیاط سے نہیں پڑھے گئے اس لیے ہر جگہ طباعت کی غلطیاں نظر آتی ہیں

مطبوعات

میرج کمیشن رپورٹ ایکس ریڈ (زبان انگریزی) | مرتب و مترجم: پروفیسر خورشید احمد صاحب ایم۔اے، ایل، ایل، بی ضخامت ۱۳۵ صفحات۔ طباعت گوارا قیمت دس روپے یا بیس شلنگ۔ شائع کردہ: چراغ راہ پبلیکیشنز، کراچی۔ لاہور میں: اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔

پاکستان بننے کے کچھ ہی مدت بعد جب اقتدار کی باگیں "متجددین" کے ہاتھ میں آئیں تو انہوں نے مسلم قوم کی عائلی زندگی میں بھی مغربی طرز فکر کی پیروی میں تغیرات کرنے کا عزم کیا۔ چونکہ انسان کا یہ گوشہ جذبات سے لبریز ہوتا ہے اس لیے اس معاملہ میں بڑی ہی چالاکی اور ہوشیاری دکھائی گئی۔ سب سے پہلے انگریز کو کوسا گیا جس نے اپنے تسلط کے دوران میں مسلمانوں کے معاشرتی قانون کے فطری ارتقاء کو روکنے کی تدابیر کیں۔ اس کے بعد مسلمان عورت کی مظلومیت پر بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ آنسو بہائے گئے۔ پھر اس کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ مسلمانوں کے پورے عائلی نظام کو بدل دیا جائے۔ امتِ مسلمہ کے لیے یہ ایک فیلڈ تھا جسے صرف اس مقصد کے لیے چھوڑا گیا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ قوم کہاں تک تبدیلی گوارا کر سکتی ہے۔ اس تجویز کے مجوزین اسے ایک ٹسٹ کیس بنانا چاہتے تھے جس کے بعد تغیرات اور تبدیلیوں کا راستہ ہموار ہو سکتا تھا۔

خدا بھلا کرے علماء حق کا جنہوں نے بروقت اس خطرہ کو بھانپتے ہوئے اس کے سدباب کی فکر کی۔ خود مولانا احتشام الحق صاحب جو اس کمیشن کے ایک معزز رکن تھے انہوں نے ایک زبردست اختلافی نوٹ تحریر کیا۔ مولانا مودودی صاحب نے بھی کمیشن کے سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے ان خطرات کی نشاندھی کی جو اس نئے طرز فکر کے پیچھے جھلک رہے تھے۔ رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس رپورٹ پر ایک نہایت فاضلانہ تبصرہ لکھا اور اس کے پیچھے جو غلط ذہن کام کر رہا تھا اس کا بڑی دیدہ وری سے پردہ چاک کیا۔

اب انہیں مقالات کو پروفیسر خورشید احمد صاحب نے نہ صرف انگریزی کے سانچے میں ڈھالا ہے بلکہ انہیں از سر نو مرتب کر کے ان کی افادیت کو بڑھا دیا ہے۔ پھر اس مجموعہ میں انہوں نے جو اپنا مقالہ شامل کیا ہے وہ ہر لحاظ سے اس میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اجتہاد خود سری کا نام نہیں بلکہ قرآن و سنت کی پیروی کا دوسرا نام ہے اس بنا پر وہ اجتہاد جو اسلاف کے سارے علمی کارناموں کو نظر انداز کر کے دین کے اندر من مانے خیالات کی ترویج و اشاعت کرے اس سے امت مسلمہ کو پناہ مانگنی چاہیے! اجتہاد کے کچھ حدود و قیود ہیں جن کی حضور سرور کائنات نے تصریح فرمائی ہے اس بنا پر ہر سر پھرا مجتہد نہیں ہو سکتا بلکہ اس فرض کو وہی شخص احسن طریق سے سرانجام دے سکتا ہے جو قرآن و سنت کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہو اور جس کا مقصد زندگی کے ہر معاملے میں خدا اور اس کے رسول کا منشا معلوم کرنا ہو۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب نے کتاب کے آخری حصے میں تعدد ازواج کے موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث اٹھائی ہے اور دلائل سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تعدد ازواج کا مسئلہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں اس کے متعلق جو سنسنی خیز خبریں پھیلائی جارہی ہے اس کے کچھ دوسرے محرکات ہیں۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے جب تعدد ازواج کے متعلق اعداد و شمار جمع کیے گئے تو معلوم ہوا کہ ایک ہزار میں سے بمشکل بیس مرد ایسے تھے جن کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ تعدد ازواج کوئی خلاف انصاف اور خلاف فطرت بات نہیں۔ اس سے بسا اوقات بہت سی عائلی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں پھر یہ اخلاق کی حفاظت اور پارسائی کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اس سلسلہ میں خورشید صاحب نے جو اقتباسات دیئے ہیں وہ یوں تو سارے ہی بڑے عمدہ ہیں لیکن مشہور لیڈر ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی تصریحات اس معاملہ میں بڑی قابلِ غور ہیں۔ وہ فرماتی ہیں:۔

> مغرب میں اگرچہ بظاہر تو ایک شادی کا رواج ہے لیکن درحقیقت وہاں تعدد ازواج کا دور دورہ ہے اور وہ بھی اس نوعیت کا جس میں مرد پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ مرد جب ایک عورت سے متمتع ہونے کے بعد اکتا جاتا ہے تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ ایک بازاری عورت بن جاتی ہے۔ پہلا عاشق اس کے مستقبل کی قطعاً کوئی ذمہ داری نہیں اٹھاتا اور اس کی حالت اس عورت کی

(باقی صـ ۶۳ پر)

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

"اسلامی نظریات اور اسلوب فکر پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جو دسترس حاصل ہے اور جس خوبی سے وہ ان مسائل کو بیان کر گزرتے ہیں وہ دور حاضر میں انہی کا حصہ ہے زیر نظر کتاب در حقیقت موصوف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۳۲-۳۳ء میں لکھے تھے لیکن کتاب کی شکل میں انکی اشاعت پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ہوئی اب خود مصنف کی نظرثانی کے بعد اسے شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مختصر طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقاید اور اساسی نظریات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید اور ضروری ہے اسے پڑھنے کے بعد ایک عام شخص بھی یہ جان سکتا ہے کہ خدا، غیب، انبیاء الہامی کتابوں، قیامت، موت کے بعد زندگی اور دوسرے بنیادی عقیدے کیوں ہیں۔ کیسے ہونے چاہئیں۔ اور یہ دین کی اساس کیوں کر ہیں؟ اسلام اور قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے اس کتاب میں ہر باشعور آدمی کے لئے اپیل ہے۔ مفہوم بلند اور عالمانہ ہونے کے باوجود انداز تحریر سبک اور شگفتہ ہے۔

پاکستان میں جس کی تشکیل و تعمیر ہی اسلامی عصبیت کی اساس پر ہے ایسی کتابوں کی اشاعت زیادہ سے زیادہ کرنی چاہئے جو دین سے بیگانگی کے رحجانات کا موثر سدباب کر سکیں اور عام خواندہ طبقے کو اسلام سے روشناس رکھ سکیں۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء)